# دعوتِ دین

## اہمیت اور آداب

مولانا سید احمد عروج قادریؒ

مرتب

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

# ترتیب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# پیش لفظ

اللہ کے بندوں کو اس کے دین کی طرف بلانا، انھیں نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا امتِ مسلمہ کا فریضۂ منصبی ہے۔ دعوت الی اللہ، تبلیغ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور شہادتِ حق اس کی مختلف تعبیریں ہیں۔ یہ درحقیقت انبیائی مشن ہے۔ اللہ کے تمام پیغمبروں نے یہ ذمے داری انجام دی ہے اور خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ فریضہ آپ کی امت پر عائد ہوتا ہے۔

دعوت کے موضوع پر اردو زبان میں قابل قدر لٹریچر موجود ہے۔ اس میں طبع زاد کتابیں بھی ہیں اور عربی زبان سے ترجمہ شدہ بھی۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہم اس موضوع پر ایک معتبر عالمِ دین کی منتخب تحریروں کا مجموعہ قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

مولانا سید احمد عروج قادری (۱۹۱۳-۱۹۸۶ء) نے ماہ نامہ زندگی رام پور کی ادارت کے زمانے میں اسلامیات کے مختلف پہلوؤں پر بڑے قیمتی مقالات لکھے تھے۔ زیر نظر مجموعہ میں شامل مقالات سے دعوتِ اسلامی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ ابتدائی دو مقالات میں دعوتِ دین کی اہمیت اور انبیائے کرام کے طریقۂ دعوت سے بحث کی گئی ہے۔ اس ضمن میں خاص طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسوہ پیش کیا گیا ہے۔ ایک مقالہ اس موضوع پر ہے کہ دعوت کی ذمہ داری صرف مسلمان مردوں پر نہیں عائد ہوتی ہے، بلکہ مسلمان خواتین بھی اس میں برابر کی شریک ہیں۔ اس ضمن میں اسلامی معاشرہ کی اساسیات اور خصوصیات بیان کرنے کے ساتھ مسلمان خواتین کی ذمہ داریوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک مقالہ اس سوال کا جواب فراہم کرتا ہے کہ موجودہ زمانے میں دعوتِ اسلامی کا طریقہ کیا ہو؟ راہِ دعوت میں کام کرنے والوں کو

اتہامات والزامات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان کی مخالفت ہوتی ہے اور ان کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں۔ بعض مقالات میں واضح کیا گیا ہے کہ ان حالات میں داعیانِ کرام کو کیا کرنا چاہیے اور انبیائے کرام کا اسوہ اس معاملے میں کیا رہ نمائی فراہم کرتا ہے؟ آخری مقالے میں بتایا گیا ہے کہ اسلامی معاشرہ کی تعمیر و تشکیل کے بنیادی اصول کیا ہیں؟ اس کے لیے کن کاموں کی انجام دہی اور کن چیزوں سے اجتناب ضروری ہے؟

ان مقالات میں دعوت سے متعلق جن موضوعات سے بحث کی گئی ہے وہ راہِ دعوت میں کام کرنے والوں کے لیے بڑے اہم ہیں۔ ان سے ان شاء اللہ مفید معلومات حاصل ہوں گی اور ان کی راہ کے نقوش روشن ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کو مصنف مرحوم کے حق میں صدقۂ جاریہ بنائے اور مرتب کو اجر سے نوازے۔ آمین۔

محمد رضی الاسلام ندوی

سکریٹری تصنیفی اکیڈمی، جماعت اسلامی ہند

# غیر مسلموں میں دعوتِ دین کی اہمیت

## فریضۂ رسالت

جب انسانوں سے آباد کوئی گاؤں، کوئی بستی، کوئی شہر، کوئی علاقہ خدا کو بھول جاتا تھا، جب کوئی قوم اپنے خالق اور اپنے حقیقی مالک سے منہ پھیر لیتی تھی، جب انسانوں کا کوئی گروہ خدا کی ذات میں، اس کی صفات میں اور اس کے حقوق و اختیارات میں دوسروں کو شریک بنالیتا تھا، جب خدا سے غفلت اس سے بغاوت و سرکشی تک پہنچ جاتی تھی، جب کوئی قوم دنیا کی محبت میں مست ہوکر، خواہشات نفس پوری کرنے میں غرق ہوجاتی تھی، جب انسانوں کی کوئی بھیڑ اپنی انسانیت فراموش کرکے جانوروں کا ریوڑ بن جاتی تھی، جب بے حیائی، بدکرداری، کمزوروں کی حق تلفی، ظلم اور سنگ دلی کسی علاقے میں عام ہوجاتی تھی، جب انسانوں کا کوئی طاقت ور جتھا، دوسرے کمزور انسانوں کا خدا بن جاتا تھا، جب عزت و وقار اور شرافت کا معیار، دولت اور قوت بن جاتی تھی، جب شرک، کفر اور گناہ کی تاریکیاں کسی انسانی معاشرے پر چھا جاتی تھیں، جب انسانیت جبر و ظلم کے شکنجے میں کسی ہوئی الاماں الاماں پکارنے لگتی تھی اور جب انسانی روح کی تشنگی اپنی آخری حد کو چھو لیتی تھی تو اس گاؤں میں، اس بستی میں، اس شہر میں اور اس علاقے میں نبوت و رسالت کا آفتاب طلوع ہوتا اور وحی الٰہی کی بارش برسنے لگتی تھی، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اپنا کوئی نبی و رسول مبعوث فرماتا تھا کہ وہ باغی و سرکش بندوں کو راہ راست پر لائے، ان تک پیغامِ حق پہنچائے اور ان کی اصلاح کرے۔

## انبیاءِ کرامؑ کا ابتدائی خطاب اور آغاز دعوت

نافرمان بندوں کی ہمہ جہتی اصلاح اوران کی زندگیوں میں کلی انقلاب کے لیے انبیاء کرام اللہ کی ہدایت کے تحت جو سب سے پہلا کام کرتے تھے وہ یہ ہوتا تھا اور یہی ہوسکتا تھا کہ انھیں بندگیِ رب کی دعوت دیں اور بتائیں کہ اللہ کے سوا ان کا کوئی اور خدا نہیں ہے۔ بلا استثناء تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا ابتدائی خطاب اوران کی دعوت کا آغاز یہی تھا، کیوں کہ تمام خرابیوں کی جڑ شرک وکفر ہے اور تمام اچھائیوں اور بھلائیوں کا سرچشمہ توحید اور ایمان باللہ ہے۔ تمام اسلامی عقیدے اسی سرچشمے سے پھوٹتے اور تمام نیکیاں اسی سے ابلتی ہیں۔ آپ دنیا کے اصل بگاڑ کا جائزہ لیں تو پائیں گے کہ خدا کے بارے میں کوئی غلط تصور اور کوئی غلط خیال اس کی جڑ ہے۔ کوئی شخص یا کوئی گروہ خدا کا انکار کرے یا اس کی ذات وصفات کے بارے میں کوئی غلط تصور جمالے، نتیجے کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ جب تک وہ غلط تصور اور غلط خیال دل ودماغ سے نوچ کر پھینک نہ دیا جائے، کوئی انسان نہ توحید کی حقیقت پاسکتا اور نہ اپنی خواہشات نفس کے منہ میں تقوے کی لگام ڈال سکتا ہے۔ عقیدۂ رسالت اور عقیدۂ آخرت کی صحت بھی عقیدۂ توحید کی صحت پر موقوف ہے۔ اگر عقیدۂ توحید میں کوئی خلل ہو تو لازماً اس کا اثر عقیدۂ رسالت اور عقیدۂ آخرت پر بھی پڑے گا۔ اس کی عبرت ناک مثال یہود ونصاریٰ ہیں۔ جب تک توحید صحیح نہ ہو اور اس پر مخلصانہ ایمان کی دولت نصیب نہ ہو، نہ دنیا سے بگاڑ کا خاتمہ ہوسکتا ہے اور نہ انسانوں کی ہمہ جہتی اصلاح ممکن ہے۔

انبیاء کرام نذیر وبشیر بنا کر بھیجے جاتے تھے، تاکہ وہ خدا کے باغیوں کو ان کے انجام بد سے خبردار کردیں اور خدا کے وفاداروں کو اس کی رحمت وخوش نودی کی خوش خبری سنادیں۔ ان کے ابتدائی خطاب اور آغاز دعوت کی پہلی مفصل سرگزشت حضرت نوح علیہ السلام کی تاریخ میں ملتی ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَالَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ (الاعراف:۵۹)

''بے شک ہم نے بھیجا نوح کو اس کی قوم کی طرف، پس اس نے کہا: اے میری قوم! بندگی کرو اللہ کی، کوئی نہیں تمھارا معبود اس کے سوا، میں خوف کرتا ہوں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب کا۔'' (ترجمہ شاہ عبدالقادرؒ)

شاہ عبدالقادرؒ نے الاعراف کی آیت میں الٰہ کا ترجمہ 'معبود' کیا ہے اور المومنون کی آیت میں اس کا ترجمہ 'حاکم' کیا ہے۔ اللہ کے سوا نہ کوئی حقیقی معبود ہے اور نہ کوئی حقیقی حاکم، جب تک انسان صرف اللہ کو واحد معبود اور واحد حاکم تسلیم نہ کر لے، ایمان باللہ کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ وہ تہلکہ خیز اور زلزلہ انداز اعلان ہے، جس نے ہمیشہ شرک و کفر کی بنیادوں کو ہلا دیا ہے اور ان بنیادوں پر اٹھائی ہوئی عمارت زمیں بوس ہوگئی ہے۔

تیسری جگہ فرمایا گیا:

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖۤ ۫ اِنِّیۡ لَکُمۡ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ۙ﴿۲۵﴾ اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰہَ ؕ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ اَلِیۡمٍ ﴿۲۶﴾

(ہود: ۲۵، ۲۶)

''اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا (اس نے کہا) میں تم لوگوں کو صاف صاف خبردار کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر ایک دردناک عذاب آئے گا۔''

چوتھی جگہ ارشاد ہوا:

اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖۤ اَنۡ اَنۡذِرۡ قَوۡمَکَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۱﴾ قَالَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡ لَکُمۡ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ۙ﴿۲﴾ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَ اتَّقُوۡہُ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ۙ﴿۳﴾ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ مِّنۡ ذُنُوۡبِکُمۡ وَ یُؤَخِّرۡکُمۡ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ اِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ اِذَا جَآءَ لَا یُؤَخَّرُ ۘ لَوۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴﴾ (نوح: ۱-۴)

''ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا (اس ہدایت کے ساتھ) کہ اپنی قوم کے لوگوں کو خبردار کر دے، قبل اس کے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آئے۔ اس نے کہا:

اے میری قوم کے لوگو! میں تمھارے لیے ایک صاف صاف خبردار کردینے والا (پیغمبر) ہوں۔ (تم کو آگاہ کرتا ہوں) کہ اللہ کی بندگی کرو، اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اللہ تمھارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمھیں ایک وقت مقرر تک باقی رکھے گا۔"

پانچویں مقام پر کہا گیا:

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ (الشعراء:۱۰۵-۱۱۰)

"قوم نوح نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جب کہ ان کے بھائی نوح نے ان سے کہا تھا: کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں۔ میرا اجر تو رب العٰلمین کے ذمے ہے۔ پس تم اللہ سے ڈرو اور (بے کھٹکے) میری اطاعت کرو۔"

ابتدائی خطاب کی ان باتوں میں کفر و شرک اور اللہ سے بغاوت کے برے انجام سے ڈرایا اور خوف دلایا گیا ہے۔ اس کی حکمت کے بارے میں ایک مفسر لکھتے ہیں:

"دعوت کے آغاز میں خوف دلانے کی حکمت یہ ہے کہ جب تک کسی شخص یا گروہ کو اس کے غلط رویے کی بدانجامی کا خطرہ نہ محسوس کرایا جائے، وہ صحیح بات اور اس کے دلائل کی طرف توجہ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ راہ راست کی تلاش آدمی کے دل میں پیدا ہی اس وقت ہوتی ہے جب اس کو یہ فکر دامن گیر ہو جاتی ہے کہ کہیں میں ٹیڑھے راستے پر تو نہیں جا رہا ہوں جس میں ہلاکت کا اندیشہ ہو۔" (تفہیم القرآن، ج ۳، ص ۵۱۰)

انذار یعنی ڈرا وا سنانے کے علاوہ آغاز دعوت میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود اور کوئی حاکم نہیں ہے۔ (۲) میری اطاعت کرو۔ (۳) میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ (۴) میں اس کام پر تم سے اجر کا طالب نہیں۔ میرا اجر اللہ رب العٰلمین کے ذمے ہے۔

آغاز دعوت میں قوم نوح سے جو مطالبہ کیا گیا وہ صرف یہ تھا کہ اللہ کی کامل بندگی کرو اور جو رسول تمھاری طرف بھیجے گئے ہیں ان کی اطاعت کرو۔ تیسری اور چوتھی بات اس دعوت کے حق ہونے کی دلیل کے طور پر کہی گئی ہے۔ قوم نوح کو ڈراوا سنانے کے ساتھ ساتھ یہ بشارت بھی سنائی گئی ہے کہ اگر وہ اس دعوت حق کو قبول کر لے تو اس کے گناہ معاف کر دیے جائیں گے اور آنے والا عذاب ٹل جائے گا۔ انذار کے ساتھ تبشیر ایک لازمی جزو کے طور پر لگی ہوئی ہے۔

اپنی دعوت کا آغاز کرتے ہوئے حضرت نوحؑ نے اس کے صحیح اور برحق ہونے کی ایک دلیل یہ دی ہے کہ ''میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔'' اس کی تشریح تفہیم القرآن میں یہ ہے:

> ''اس کے دو مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ میں اپنی طرف سے کوئی بات بنا کر یا کم وبیش کر کے بیان نہیں کرتا، بلکہ جو کچھ خدا کی طرف سے مجھ پر نازل ہوتا ہے وہی بے کم وکاست تم تک پہنچا دیتا ہوں۔ اور دوسرا مفہوم ہے کہ میں ایک ایسا رسول ہوں جسے تم پہلے سے ایک امین اور راست باز آدمی کی حیثیت سے جانتے ہو۔ جب میں خلق کے معاملے میں خیانت کرنے والا نہیں ہوں تو خالق کے معاملے میں کیسے خیانت کر سکتا ہوں؟! لہٰذا تمھیں باور کرنا چاہیے کہ جو کچھ میں خدا کی طرف سے پیش کر رہا ہوں اس میں بھی ویسا ہی امین ہوں جیسا دنیا کے معاملات میں آج تک تم نے مجھے امین پایا ہے۔''
>
> (جلد ۳، ص ۵۱۱)

دوسری دلیل حضرت نوحؑ نے یہ دی تھی کہ ''میں اس پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔'' اس دلیل کی تشریح تفہیم القرآن میں یہ ہے:

> ''دوسری دلیل ہے کہ میں ایک بے غرض آدمی ہوں۔ تم کسی ایسے ذاتی فائدے کی نشان دہی نہیں کر سکتے جو اس کام سے مجھے حاصل ہو رہا ہو، یا جس کے حصول کی میں کوشش کر رہا ہوں۔ اس بے غرضانہ طریقہ سے کسی ذاتی فائدے کے بغیر جب میں اس دعوت حق کے کام میں شب و روز اپنی جان کھپا رہا ہوں، اپنے اوقات اور اپنی محنتیں صرف کر رہا ہوں اور ہر طرح کی تکلیفیں اٹھا رہا ہوں تو تمھیں باور کرنا چاہیے کہ میں اس کام میں مخلص ہوں۔ ایمان داری کے ساتھ جس چیز کو حق جانتا ہوں اور جس کی پیروی میں خلق خدا کی فلاح دیکھتا ہوں وہی پیش کر رہا ہوں۔ کوئی نفسانی جذبہ اس کا

محرک نہیں ہے کہ اس کی خاطر میں جھوٹ گھڑ کر لوگوں کو دھوکا دوں۔ یہ دونوں دلیلیں ان اہم دلائل میں سے ہیں جو قرآن مجید نے بار بار انبیاء علیہم السلام کی صداقت کے ثبوت میں پیش کی ہیں اور جن کو وہ نبوت کے پرکھنے کی کسوٹی قرار دیتا ہے۔''

(ج ۳، ص ۵۱۱)

اب یہ بھی دیکھ لیجیے کہ حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کو بندگیِ رب اور اپنی اطاعت کی دعوت کتنی مدت تک دیتے رہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ؕ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝

(العنکبوت: ۱۴)

''ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور پچاس کم ایک ہزار برس ان کے درمیان رہا۔ آخر کار ان لوگوں کو طوفان نے آگھیرا۔ اس حال میں کہ وہ ظالم تھے۔''

مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے اپنے حاشیۂ قرآن میں لکھا ہے:

''ابن عباس ؓ سے منقول ہے کہ حضرت نوح ؑ چالیس سال کی عمر میں مبعوث ہوئے۔ ساڑھے نو سو برس دعوت و تبلیغ اور سعی اصلاح میں مصروف رہے۔ پھر طوفان آیا۔ طوفان کے بعد ساٹھ سال زندہ رہے اس طرح کل عمر ایک ہزار پچاس سال ہوئی۔''

دعوت و تبلیغ کی پوری مدت میں انھوں نے جن مصائب و شدائد کے درمیان زندگی بسر کی، اس کو قرآن نے 'کربِ عظیم' کہا ہے۔

## آغازِ دعوت ہمیشہ یکساں رہا

اس کے بعد قرآن کا مطالعہ کر کے دیکھیے کہ کیا حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک ہزاروں سال کی طویل مدت میں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے ابتدائی خطاب اور ان کی دعوت کے نقطۂ آغاز میں کوئی فرق واقع ہوا یا نہیں؟ کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی بگڑی ہوئی قوم بنی اسرائیل کی اصلاح

کے لیے اسے جو دعوت دی وہ بھی وہی تھی جو حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی مشرک و کافر قوم کو دی تھی:

وَ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۟ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝

(آل عمران: ۵۰، ۵۱)

''دیکھو، میں تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں۔ لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اللہ میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی۔ لہٰذا تم اسی کی بندگی کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔''

اور یہی بات وہ خدا کے روبرو قیامت کی عدالت میں عرض کریں گے:

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِيْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ ۚ وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَ اَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝

(المائدۃ: ۱۱۷)

''میں نے ان سے اس کے سوا کچھ نہیں کہا جس کا آپ نے حکم دیا تھا، یہ کہ اللہ کی بندگی کرو، جو میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی۔ میں اسی وقت تک ان کا نگراں تھا جب تک کہ میں ان کے درمیان تھا۔ جب آپ نے مجھے واپس بلا لیا تو آپ ان پر نگراں تھے اور آپ تو ساری ہی چیزوں پر نگراں ہیں۔''

انبیاءِ کرام نے اپنی قوموں کو اچھے اعمال کی نصیحت بھی کی اور انھیں برے اعمال سے روکا بھی، لیکن جن قوموں نے ان کی اصل دعوت کو بہرے کانوں سے سنا تھا، وہ ان کی ان نصیحتوں پر کیا کان دھرتے۔ جس طرح انھوں نے ان کی اصل دعوت کا انکار کیا اسی طرح ان کی عملی نصیحتوں کا بھی مذاق اڑایا اور آخر کار تباہ و برباد ہوئے۔ جو لوگ دنیا کے آرام اور یہاں کی لذتوں کے عاشق ہوتے ہیں وہ صرف انھی باتوں پر کان دھرتے ہیں جن سے ان کا یہ مقصد حاصل ہو رہا ہو یا اس کے حاصل ہونے کی توقع ہو۔

## سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جدوجہد کا اولین مرحلہ

پھر جب اللہ رب العلمین نے تمام جن وانس کی ہدایت کے لیے اپنا آخری نبی ورسول مبعوث فرمایا، اپنی آخری کتاب نازل کی اور ایک ایسی مکمل شریعت عطا فرمائی، جس میں قیامت تک کسی ترمیم و تنسیخ کی ضرورت پیش نہ آئے تو آخری رسول کا ابتدائی خطاب اوران کی دعوت کا نقطۂ آغاز بھی وہی رہا جو حضرت نوحؑ کی دعوت کا نقطۂ آغاز تھا۔ فرق صرف یہ ہوا کہ پہلے **یَا قَوْمِ** (اے میری قوم!) سے خطاب شروع ہوتا تھا اور اب **یَآاَیُّھَا النَّاسُ** (اے دنیا جہان کے لوگو!) سے خطاب شروع ہوا۔

قُلۡ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَيۡكُمۡ جَمِيۡعَا ۨ الَّذِىۡ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحۡىٖ وَيُمِيۡتُ‌ ۖ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهِ النَّبِىِّ الۡاُمِّىِّ الَّذِىۡ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوۡهُ لَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ ۝ (الاعراف:۱۵۸)

''اے محمد! کہو، اے انسانو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی امّی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے اور پیروی اختیار کرو اس کی، امید ہے کہ تم راہ راست پالو گے۔''

اس آیت میں جس اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے وہ آسمانوں کا بادشاہ بھی ہے اور زمین کا بادشاہ بھی۔ اللہ کی بادشاہی اور اس کی حاکمیت وہ حقیقت ہے کہ اس کو تسلیم کیے بغیر عقیدۂ توحید کا وجود ہی ممکن نہیں ہے۔ حاکمیتِ الٰہ کا عقیدہ سیاست نہیں، بلکہ عین توحید ہے۔ پھر پورے قرآن کا مطالعہ کر کے دیکھیے کہ اللہ کی بادشاہی، اس کی حاکمیت اور اس کی مالکیت کی حقیقت کو کتنی بار دہرایا گیا ہے اور اسے کس قدر نمایاں کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو تسلیم کیے بغیر اور اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالے بغیر نہ کبھی کسی کو ہدایت ملی ہے اور نہ آئندہ ملے گی

اور یہی وجہ ہے کہ آغازِ دعوت ہی میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسولؐ سے اس حقیقت کا اعلان کرایا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ○

(الحج:۱)

''لوگو! اپنے رب کے غضب سے بچو۔ حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا زلزلہ بڑی (ہول ناک) چیز ہے۔''

تیسری جگہ ارشاد ہے:

قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَاۤ اَنَا لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۚ○ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِیْمٌ ○ وَالَّذِیْنَ سَعَوْا فِیْۤ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ ○

(الحج:۴۹-۵۱)

''اے محمدؐ! کہہ دو کہ لوگو! میں تمھارے لیے صرف وہ شخص ہوں جو (براوقت آنے سے پہلے) صاف صاف خبردار کردینے والا ہو۔ پھر جو ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے ان کے لیے مغفرت ہے اور عزت کی روزی اور جو ہماری آیات کو نیچا دکھانے کی کوشش کریں گے وہ دوزخ کے یار ہیں۔''

چوتھی جگہ کہا گیا:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْـًٔا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ○ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ○ (الحج:۷۳، ۷۴)

''لوگو! ایک مثال دی جاتی ہے، غور سے سنو۔ جن معبودوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے، بلکہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز

چھین لے جائے تو وہ اسے چھڑا بھی نہیں سکتے۔ مدد چاہنے والے بھی کم زور اور جن سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کم زور۔ ان لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہ پہچانی، جیسا کہ اس کے پہچاننے کا حق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قوت اور عزت والا تو اللہ ہی ہے۔''

پانچویں جگہ فرمایا:

الٓرٰ قف كِتٰبٌ اُحۡكِمَتۡ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتۡ مِنۡ لَّدُنۡ حَكِيۡمٍ خَبِيۡرٍۙ ۝ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِىۡ لَـكُمۡ مِّنۡهُ نَذِيۡرٌ وَّبَشِيۡرٌۙ ۝ وَاَنِ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَيۡهِ يُمَتِّعۡكُمۡ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُـؤۡتِ كُلَّ ذِىۡ فَضۡلٍ فَضۡلَهٗ ؕ وَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنِّىۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ عَذَابَ يَوۡمٍ كَبِيۡرٍ ۝ اِلَى اللّٰهِ مَرۡجِعُكُمۡ‌ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ۝ (ہود ۱:۱۱-۴)

''ا ل ر۔ فرمان ہے، جس کی آیتیں پختہ اور مفصل ارشاد ہوئی ہیں۔ ایک دانا اور باخبر ہستی کی طرف سے کہ تم نہ بندگی کرو مگر صرف اللہ کی۔ اس کی طرف سے تم کو خبر دار کرنے والا بھی ہوں اور بشارت دینے والا بھی اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ ایک مدت تک تم کو اچھا سامانِ زندگی دے گا اور صاحب فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا۔ لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو میں تمھارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ تم سب کو اللہ کی طرف پلٹنا ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔''

جب سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے آئے اور وہاں اسلامی حکومت قائم ہوگئی اور وہاں سے لوگوں کو دین کی دعوت دی گئی تو وہ یہی تھی کہ:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ وَالَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَۙ ۝ الَّذِىۡ جَعَلَ لَـكُمُ الۡاَرۡضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّـكُمۡ فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا وَّاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۝

(البقرۃ ۲:۲۱،۲۲)

''لوگو! بندگی اختیار کرو اپنے اس رب کی جو تمھارا اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں، سب کا خالق ہے۔ تمھارے بچنے کی توقع اس صورت سے ہو سکتی ہے۔ وہی تو ہے جس نے تمھارے لیے زمین کا فرش بچھایا، آسمان کی چھت بنائی، اوپر سے پانی برسایا اور اس کے ذریعے سے ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمھارے لیے رزق بہم پہنچایا۔ پس جب تم یہ جانتے ہو تو دوسروں کو اللہ کا مدِ مقابل نہ ٹھیراؤ۔''

تمام نوعِ انسانی کے سامنے یہ وہ اصل بات پیش کی گئی جس کی طرف بلانے کے لیے قرآن مجید آیا ہے۔

## دعوت الی اللہ

اگر پورے دین کی طرف دعوت کا تعارف ایک جملے میں کرانا ہو تو اس کے لیے قرآن مجید میں دعوت الی اللہ (اللہ کی طرف دعوت) کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ کیونکہ ایمان باللہ ہی پورے دین کا مرکزی نکتہ ہے۔ سورۂ یوسف میں ارشاد ہوا ہے:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ
وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ (یوسف:١٠٨)

''تم ان سے صاف کہہ دو کہ میرا راستہ تو یہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی۔ اور اللہ پاک ہے اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔''

دوسری جگہ فرمایا گیا:

وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۣ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ۭ لَهُ الْحُكْمُ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ (القصص:٨٧،٨٨)

''اور ایسا کبھی نہ ہونے پائے کہ اللہ کی آیات جب تم پر نازل ہوں تو کفّار تمھیں ان سے باز رکھیں۔ اپنے رب کی طرف دعوت دو اور ہرگز مشرکوں میں شامل نہ ہو، اور اللہ کے سوا کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ ہر چیز ہلاک

ہونے والی ہے سوائے اس ذات کے۔ فرماں روائی اسی کی ہے اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو۔''

تیسری جگہ کہا گیا:

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ؕ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ؕ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَ اِلَيْهِ مَاٰبِ ۝ (الرعد:۳۶)

''تم صاف کہہ دو کہ مجھے تو صرف اللہ کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے کہ کسی کو اس کے ساتھ شریک ٹھیراؤں۔ لہٰذا میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے۔''

چوتھی جگہ ارشاد ہوا:

وَ مَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّ قَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ (حٰمٓ السجدہ:۳۳)

''اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی، جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔''

پانچویں جگہ اللہ کی طرف دوڑنے اور بھاگنے کی دعوت دی گئی ہے۔

فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ۚ وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ (الذاریٰت:۵۰،۵۱)

''پس دوڑو اللہ کی طرف، میں تمھارے لیے اس کی طرف سے صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں اور نہ بناؤ اللہ کے ساتھ کسی کو دوسرا معبود۔ میں تمھارے لیے اس کی طرف سے صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں۔''

اس میں دوسری آیت صاف بتا رہی ہے کہ پہلی آیت میں توحید کی دعوت دی گئی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اے شرک میں مبتلا بندو! شرک سے پاک صاف ہو کر اللہ کی طرف دوڑو اور صرف اسی کی چوکھٹ پر اپنے سر جھکا دو۔

## کیا بات سامنے آئی؟

اس تفصیل سے یہ بات سامنے آئی کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو اقامت دین کے جس مشن پر بھیجتا رہا اس کا اولین مرحلہ یہ تھا کہ وہ اللہ کے مشرک بندوں تک توحید کا پیغام پہنچائیں اور انھیں شرک، کفر اور معصیت کے انجام بد سے خبردار کریں، کیوں کہ جب تک اللہ کے بندے صرف اللہ ہی کو اپنا معبود، مالک اور حاکم تسلیم نہ کرلیں اور اپنی پوری زندگی اس کی بندگی کے حوالے نہ کردیں، پورے دین کا قیام اور ادیان باطلہ پر اس کا غلبہ ممکن نہیں ہے۔

یہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ نبیوں اور رسولوں نے دعوت وتبلیغ کا یہ اولین فریضہ پوری طرح انجام دیا اور وہ اس ذمہ داری کو زندگی کے آخری لمحے تک ادا کرتے رہے، خواہ کسی نے ان کی دعوت حق قبول کی ہو یا نہ کی ہو۔ حضرت نوحؑ ساڑھے نو سو برس تک اپنی مشرک قوم کو پکارتے رہے۔ خلوت میں، جلوت میں، علانیہ، مخفی طور پر، سمجھا کر، ڈرا کر، ترغیب دے کر، ہر طرح انھیں اللہ کی طرف بلاتے رہے۔ لیکن صدیوں کی اس طویل مدت میں محض تھوڑے سے لوگ ایمان لائے، جیسا کہ قرآن نے خود کہا ہے: وَمَا اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ (ہود: ۴۰) ''اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوح کے ساتھ ایمان لائے تھے۔'' اور حضرت لوط علیہ السلام کی دعوت پر تو اتنے لوگ بھی ایمان نہیں لائے جتنے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت پر لائے تھے، بلکہ سورۂ ذاریات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام جس علاقے میں بھیجے گئے تھے اس میں بجز ان کے گھر والوں کے کوئی ایک شخص بھی ایمان نہیں لایا اور گھر والوں میں بھی خود ان کی بیوی ایمان نہ لائی۔

اس سے پوری طرح یہ بات واضح ہوئی کہ شرک وکفر میں مبتلا انسانوں تک توحید و ایمان کا پیغام پہنچانا اور انھیں اللہ کی طرف بلانا انبیاء کرام کا وہ فریضہ ہے جسے ہر حال میں انھوں نے انجام دیا ہے۔ غیر مسلموں میں دعوت دین کی اہمیت کا اس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا ہوگا۔

(ماہ نامہ زندگی، رام پور، جولائی ۱۹۷۷)

# غیر مسلم معاشرے میں مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں

مسلمان عورتوں کی ذمہ داریوں کے لحاظ سے عہد حاضر میں مسلم معاشرے اور غیر مسلم معاشرے کے درمیان زیادہ فرق باقی نہیں رہا ہے، کیوں کہ مسلم معاشرہ بھی طرح طرح کی خرابیوں کا شکار ہو گیا ہے۔ غیر مسلم معاشرے میں مسلمان خواتین کی اصلی اور حقیقی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اسلام اور اسلامی معاشرے کی نمایندگی کریں، اپنے قول سے بھی اور عمل سے بھی۔ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان خواتین اسلام اور اسلامی معاشرے کی بنیادوں کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ اسی ضرورت کے پیش نظر ہمارا یہ مقالہ چند نکات پر مشتمل ہوگا۔

(۱) اسلام کیا ہے؟ (۲) اسلامی معاشرے کی بنیادیں کیا ہیں؟ (۳) اسلامی معاشرے کی خصوصیات و امتیازات کیا ہیں؟ (۴) اسلامی معاشرے میں عورتوں کا مقام کیا ہے؟ (۵) عورتوں کا دائرۂ کار کیا ہے؟ (٦) ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

## (۱) دین اسلام کیا ہے؟

ابتدا ہی میں دو باتیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں۔ پہلی بات یہ کہ دین اسلام کو جاننے کا اصل اور صحیح ترین ماخذ کتاب و سنت ہے۔ قرآن کریم اور صحیح احادیث ہی سے ہم یہ جان سکتے ہیں کہ اسلام کیا ہے؟ دوسری بات یہ کہ قرآن کی آیتوں اور صحیح احادیث میں جو حقیقتیں بیان کی گئی

ہیں اور جو احکام دیے گئے ہیں ان کی وہی تعبیر وتشریح صحیح اور مستند ہے جو خود نبی ﷺ، ان کے مقدس ساتھیوں اور ائمہ دین نے اپنے قول وعمل سے پیش کی ہے اور جس پر چودہ سو سال سے اہل حق کا اتفاق چلا آرہا ہے۔

قرآن کریم، احادیث نبویؐ اور اسوۂ نبویؐ سے بغیر کسی شک کے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین اسلام ایک ایسے نظام اطاعت کا نام ہے جو انسانی زندگی کے لیے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے اور جس کے دائرے سے حیات انسانی کا کوئی شعبہ باہر نہیں ہے۔ اس نظم اطاعت کی سربفلک عمارت جن بنیادوں پر تعمیر ہوتی ہے انھیں ہم عقائد کہتے ہیں۔ یہ بنیادیں جتنی گہری اور مضبوط ہوں گی۔ عمارت اتنی ہی مضبوط و مستحکم، وسیع اور عالی شان ہوگی اور جتنی سطحی اور کمزور ہوگی اتنی ہی بودی، تنگ اور بے رونق ہوگی۔ دین اسلام کے تین بنیادی عقائد ہیں ـــــ توحید، رسالت اور آخرت ـــــ یعنی اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ پر ایمان، اس کے رسولوں پر ایمان، کتابوں پر ایمان اور آخرت پر ایمان۔

## توحید

توحید یہ ہے کہ ہمیں اس حقیقت پر کامل یقین اور اطمینان حاصل ہو کہ صرف اللہ ہی اس پوری کائنات کا خالق، مالک، رب، معبود اور حاکم ہے۔ اس کی الوہیت اور ربوبیت میں اس کا کوئی شریک اور ساجھی نہیں ہے۔ کوئی اس کا مثل اور ہم سر نہیں ہے۔ اس کائنات کی ہر شے اپنے وجود اور بقا میں اس کی محتاج ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں، بلکہ تنہا اس کی ذات غنی اور بے نیاز ہے۔ وہ ہر نقص اور ہر عیب سے پاک ہے اور ہر چیز کی حیات وموت اور بناؤ بگاڑ صرف اسی کے دست قدرت میں ہے۔ پرستش کا مستحق صرف وہی ہے، کوئی دوسرا پرستش کے لائق نہیں۔ اطاعت کے لائق صرف وہی ہے، کسی دوسرے کی اطاعت اور فرماں برداری اس کی اجازت کے بغیر جائز نہیں ہے۔ ہر اطاعت اس کی اطاعت کی تابع ہے۔ وہ مالک ہے اور سب اس کے غلام اور اس کی رعیت ہیں۔ وہ بادشاہ ہے اور صرف اسی کا حکم اور فرمان لائق تعمیل ہے۔ اس کے اذن کے بغیر ہر حکم اور ہر فرمان باطل اور مردود ہے۔ وہ علیم ہے اور اس کا علم پوری کائنات پر محیط ہے۔ ہر چھوٹی بڑی چیز اس کے دائرۂ علم کے اندر ہے۔ اس کے علم تک کسی کی رسائی نہیں الّا یہ کہ وہ خود

کسی کو کچھ بتائے اور سکھائے۔ وہ انسان کا خالق ہے اور اسی کو حق ہے کہ اپنی تخلیق کا مقصد بتائے، مخلوق کو اس کا حق نہیں کہ وہ اپنی زندگی کا مقصد خود متعین کرے۔ وہ رحمٰن و رحیم، حکیم اور عادل ہے۔ یہ کائنات اس کی رحمت، حکمت اور عدل کی جلوہ گاہ ہے۔ وہ ہادی ہے اور اس کی ہدایت اس رحمت، حکمت اور عدل سے ہم رشتہ ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء حسنیٰ (بہترین نام) گنائے گئے ہیں۔ ان میں کا ہر نام اس کی کسی ایک صفت کا اظہار کرتا ہے۔ جب تک اللہ پر ان تمام صفات کے ساتھ ایمان نہ لایا جائے جن کا ذکر قرآن اور احادیث میں ہے، توحید مکمل نہیں ہوتی۔ توحید کے مدعی اہل کتاب بھی ہیں، آریہ سماجی بھی اور کچھ دوسرے فرقے بھی۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کی توحید، شرک کے ساتھ مخلوط ہے اور ان میں کا کوئی بھی حقیقی معنی میں موحد نہیں ہے۔ قرآن کریم میں مشرکوں اور اہل کتاب دونوں کے بارے میں کہا گیا ہے:

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ (الانعام:۹۱)

''اور انھوں نے اللہ کی قدر نہیں پہچانی، جیسا کہ اس کی قدر پہچاننے کا حق ہے۔''

توحید تمام عقائد و اعمال کی اصل ہے اس لیے جب تک اس کی تکمیل نہ ہو، ایمان باللہ کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص فی الواقع موحد ہو تو اس کے لیے رسالت اور آخرت پر ایمان لانا دشوار نہ رہے، اس لیے کہ یہ دونوں عقیدے عقیدۂ توحید ہی کا تقاضا اور اس کی فرع ہیں۔

## رسالت

رسالت اللہ کے بندوں تک اس کا پیغام پہنچا دینے کا ایک عظیم منصب ہے۔ یہ منصب اللہ نے اپنے ان برگزیدہ بندوں کو عطا فرمایا جو اللہ کے علم میں اس کے اہل تھے۔ رسالت اور نبوت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو عبادت، ریاضت، مراقبہ، دھیان گیان یا کسی اور تدبیر سے حاصل ہو سکتی ہو۔ قرآن کریم میں اس حقیقت کو متعدد مقامات پر، مختلف اسلوب سے واضح کیا گیا ہے۔ مثلاً فرمایا گیا ہے:

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ (الانعام:۱۲۴)

''اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ اپنی پیغام بری کا منصب کس کو عطا کرے۔''

رسالت اللہ تعالیٰ کی رحمت، حکمت اور عدل کا لازمی تقاضا ہے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کی رحمت، انسان کی مادی زندگی کے لیے تو تمام انتظامات فرمائے، لیکن اس کی روحانی زندگی کے لیے کوئی انتظام نہ کرے؟ یہ کون باور کر سکتا ہے کہ کوئی عادل اور انصاف پرور بادشاہ اپنی رعیت کو جرائم سے تو بالکل آگاہ نہ کرے اور پھر انھیں کسی جرم میں پکڑے؟ یہ بات کسی معمولی حاکم سے بھی متوقع نہیں ہے، سب سے بڑے حاکم سے کس طرح متوقع ہوگی۔ رسالت کی حقیقت یہی ہے کہ اللہ نے رسولوں اور کتابوں کے ذریعہ اپنی مرضیات و نامرضیات کی پوری تفصیل بتادی ہے اور اس کے نازل کردہ قوانین ہی جزا و سزا کے معیار ہیں۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے سب سے پہلے نبی تھے اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے آخری نبی و رسول ہیں اور قرآن حکیم اللہ کی آخری کتاب ہے۔ اب نہ کوئی نبی آنے والا ہے اور نہ کوئی کتاب نازل ہونے والی ہے۔ قرآن ہی کے مجموعۂ احکام و شرائع کا نام دین اسلام ہے۔ دنیا کے آخری نبی نے اپنے قول و عمل سے اس مجموعہ کی پوری طرح توضیح و تشریح کردی ہے اور ان کی سنت دین کا دوسرا ماخذ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری نبی و رسول کی سیرت کو تا قیامت مسلمانوں کے لیے اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست　　اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

## آخرت

آخرت امتحان و آزمائش کے پیریڈ کے اختتام اور ایک نئے ابدی اور لازوال پیریڈ کے افتتاح کا نام ہے۔ وہ انسانی زندگی کا آخری انجام ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ یہ دنیا ہمیشہ کے لیے نہیں بنائی گئی ہے، بلکہ یہ سارا ہنگامۂ وجود انسان کی آزمائش کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ یہ ایک عارضی دَور ہے۔ جب یہ دور پورا ہو جائے گا تو اسے توڑ پھوڑ دیا جائے گا اور قیامت کا ہولناک دن آجائے گا۔ میدانِ حشر میں تمام انسان اپنی اسی روح اور جسم کے ساتھ، جو وہ دنیا میں رکھتے تھے، خدا کے سامنے حاضر کیے جائیں گے اور ان سب کی زندگی کا محاسبہ ہوگا۔ اس آخری محاسبے کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار انسان کے اپنے عقیدہ و عمل پر ہوگا۔ وہاں نجات نہ خریدی جاسکے گی اور نہ کسی ایسی شفاعت کا تصور کیا جاسکتا ہے جس کے زور سے نجات حاصل کی جاسکے۔ اللہ تعالیٰ

تمام فیصلے انسانوں کے عقیدہ وعمل کی بنا پر کرے گا۔ شفاعت کی حیثیت، شفاعت کرنے والے کی عزت افزائی کے سوا اور کچھ نہ ہوگی۔ اس لیے کہ ہر شفاعت اللہ کے اذن پر موقوف ہوگی، بلا اذن کسی کو لب کھولنے کی مجال بھی نہ ہوگی۔ اسی آخری محاسبے کے بعد جنتی جنت میں جائیں گے اور دوزخی دوزخ میں جائیں گے اور آخرت کا وہ دَور شروع ہوگا جو کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔ قرآن اور صحیح احادیث نے ہمیں آخرت کے جس عقیدے کی تعلیم دی ہے اس سے تناسخ کی بھی نفی ہوتی ہے اور اہل کتاب کے تصور کی تردید بھی۔

توحید، رسالت اور آخرت کی یہ انتہائی مختصر تشریح بھی یہ جاننے کے لیے کافی ہے کہ اسلام محدود معنی میں کوئی مذہب نہیں ہے، بلکہ زندگی کا ایک جامع دستور اور مکمل نظام ہے۔ یہ ایک انقلابی تحریک ہے، جو حیات انسانی کی اس نقشے پر تعمیر کرتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے اور اس نظام کی خوبی اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نظام سرمایہ داری اور نظام اشتراکیت کی افراط و تفریط نہیں پائی جاتی، بلکہ یہ ایک نہایت مکمل اور معتدل اجتماعی نظام ہے۔ یہ فرد اور اجتماع دونوں ہی کا حق پہچانتا ہے اور دونوں کو اپنی حد کے اندر رکھتا ہے۔ یہ جسم و روح دونوں ہی کے مطالبات کا تسلی بخش جواب ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آخرت کی کامیابی اور سرخ روئی تمام تر صرف اسی دین سے وابستہ ہے۔ دین اسلام کو سمجھنے، اس پر عمل کرنے، اس کو پھیلانے اور قائم کرنے کی جدوجہد کا محرک اور مقصد اصلی یہی ہے کہ اللہ کی رضا اور آخرت کی سرخ روئی حاصل ہو۔

## (۲) اسلامی معاشرے کی پانچ بنیادیں

اوپر اسلام کے تین بنیادی عقائد کی جو مختصر تشریح کی گئی ہے اسی پر حیات انسانی کی پوری عمارت قائم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی مسئلہ، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اسلامی عقائد سے بے تعلق نہیں ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔ ان عقائد کو سمجھے بغیر اور ان کو دل سے مانے بغیر کسی مسئلے کی تسلی بخش توجیہ نہیں کی جاسکتی۔ اسلامی معاشرہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اختصار کے ساتھ ان بنیادوں کو سمجھنا ہو تو ہم اس کی پانچ بنیادیں قرار دے سکتے ہیں۔ یہ پانچوں بنیادیں سورۂ النساء کی پہلی عظیم الشان آیت میں موجود ہیں۔ ان کی مختصر تشریح سے پہلے دو باتیں سامنے رکھنی چاہئیں۔ پہلی یہ کہ جب انسانی معاشرے کا آغاز ہوا تھا تو اس وقت ایک ہی معاشرہ تھا، ہی

انسانی معاشرہ بھی تھا اور وہی اسلامی معاشرہ بھی ـــ انسانی اور اسلامی معاشرے میں تفریق پیدا نہیں ہوئی تھی، مگر اب اس وقت انسانی معاشروں میں اسی قدر تفریق پیدا ہو چکی ہے جس کی کوئی حد وانتہا نہیں ہے۔ اس وقت دنیا میں بیسیوں قسم کے انسانی معاشرے موجود ہیں۔

دوسری بات یہ کہ ہر معاشرہ اور اس کے مسائل اس معاشرے کے تصور حیات و کائنات سے وابستہ ہوتے ہیں۔ کوئی معاشرہ زندگی اور دنیا کے بارے میں جو عقیدہ رکھتا ہے اسی کے مطابق وہ معاشرہ بنتا اور تعمیر ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرہ اسی تصورِ حیات و کائنات پر مبنی ہے جس کا ذکر اسلام کے تعارف میں گزرا۔

## پہلی بنیاد: وحدت الٰہ

اسلامی معاشرے کی پہلی بنیاد الٰہِ واحد پر سچا ایمان اور اس کا تقویٰ ہے۔ جو لوگ قرآن کریم کی تلاوت سمجھ کر کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اسلامی معاشرے کا کوئی مسئلہ ہو اس کو بیان کرنے سے پہلے یا درمیان میں یا اخیر میں اِتَّقُوا اللهَ (اللہ سے ڈرتے رہو) یا اِتَّقُوا رَبَّكُمْ (اپنے رب سے ڈرتے رہو) کا حکم ضرور دیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ کا تقویٰ ہی وہ برقی رَو ہے جس سے مومن کا دل روشن اور بیدار رہتا ہے اور یہی چیز اس کو اللہ تعالیٰ کی والہانہ اطاعت پر آمادہ رکھتی ہے۔ اوامر واحکام کی تعمیل اور منہیات وممنوعات سے اجتناب اس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہ تقویٰ ہی ہے جو مومن کو انتہائی خوشی اور انتہائی غم کے موقع پر بھی اطاعت الٰہی سے منحرف نہیں ہونے دیتا۔ یہ غائب یا مضمحل ہو جائے تو مومن کے قلب کا بلب یا تو بجھ جاتا ہے یا اس کی روشنی مدھم پڑ جاتی ہے۔

## دوسری بنیاد: وحدت آدم

اسلامی معاشرے کی دوسری بنیاد یہ ہے کہ تمام انسان، جو روئے زمین پر پائے جاتے ہیں، سب ایک کنبہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ سب کے سب ایک انسانی جوڑے آدم وحوا کی اولاد ہیں۔ یہ بنیاد نسل ونسب کے غرور کو چور چور کر دیتی ہے۔ جب حقیقت یہ ہے کہ تمام انسان ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں تو پھر نسل ونسب کا غرور حماقت کے سوا اور کیا ہے؟ انسان کی عزت وذلت کا دارومدار ایمان اور تقویٰ پر ہے نہ کہ کسی نسل یا نسب پر ـــ

آج نسل ونسب اور گورے رنگ کے غرور نے کیسا ہول ناک فساد برپا کر رکھا ہے۔افسوس ہے کہ مسلمان معاشرے میں بھی یہ حماقت گھس آئی ہے۔

## تیسری بنیاد: عورت کی صحیح حیثیت

یہ تیسری بنیاد فی الواقع دوسری بنیاد کی ایک فرع ہے۔ مرد اور عورت کے جائز ملاپ سے خاندان وجود میں آتا ہے اور متعدد خاندانوں سے مل کر معاشرہ بنتا ہے۔قرآن کہتا ہے کہ مرد ہی کی جنس سے عورت کو پیدا کیا گیا ہے، عورت کی کوئی الگ جنس نہیں ہے۔ آدم ہی کی جنس سے حوا پیدا کی گئی تھیں، اس لیے عورت حقیر وذلیل نہیں ہے۔ یہ شرف انسانیت میں مردوں کی برابر کی شریک ہے۔ یہ انسانی معاشرے میں بعض پہلوؤں سے عضو ضعیف تو ہے، لیکن عضو حقیر وذلیل ہرگز نہیں ہے۔عورت مرد ہی کی طرح محترم ومعزز ہے اس کے حقیر وذلیل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔آج مسلم معاشرے میں بھی طرح طرح کی جو خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں وہ اسی حقیقت کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ ہیں۔

## چوتھی بنیاد: صلہ رحمی

اسلامی معاشرے کی چوتھی بنیاد یہ ہے کہ رشتے کے حقوق ادا کیے جائیں۔ بیٹا باپ کے حقوق ادا کرے اور باپ بیٹے کے حقوق، ماں بیٹی کے حقوق ادا کرے اور بیٹی ماں کے حقوق۔ شوہر بیوی کے حقوق ادا کرے اور بیوی شوہر کے — غرض یہ کہ رحم کے تعلق سے جتنے رشتے وجود میں آتے ہیں۔ ان سب کے حقوق پوری طرح اور اچھی طرح ادا کیے جائیں۔ صلہ رحمی کے بیان، اس کی تشریح اور اس کے احکام سے قرآن کریم اور احادیث بھری ہوئی ہیں۔ صرف اسی موضوع پر ایک طویل مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔ دین اسلام میں اس کی اہمیت یہ ہے کہ جو اس کو جوڑتا ہے خدا اس سے جڑتا ہے اور جو اس کو کاٹتا ہے خدا اس سے کٹتا ہے۔

## پانچویں بنیاد: اللہ کی نگرانی کا استحضار

یہ عقیدہ کہ ہر وقت اللہ اپنے بندوں اور ان کے تمام کاموں کی نگرانی کر رہا ہے۔ اسلامی معاشرے کی پانچویں بنیاد ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝ (النساء:۱)

''اے لوگو! اپنے اس رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سارے مرد اور عورتیں پھیلا دیں اور ڈرو اس اللہ سے جس کے واسطے سے تم باہم گر طالب مدد ہوتے ہو اور ڈرو قطع رحم سے۔ بے شک اللہ تمھاری نگرانی کر رہا ہے۔''

دیکھ لیجیے کہ اس ایک آیت میں وہ پانچوں بنیادیں موجود ہیں یا نہیں، جن کی طرف اوپر محض اشارے کیے گئے ہیں؟!

## (۳) اسلامی معاشرے کی خصوصیات و امتیازات

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلامی معاشرہ کن خصوصیات و امتیازات کا حامل ہوتا ہے؟ اس مقالے میں تفصیل سے اس پر گفتگو نہیں کی جا سکتی، تفصیل کے لیے سورۂ الانعام آیات ۱۵۱ تا ۱۵۴، سورۂ النحل آیت ۹۰، ۹۱ اور سورۂ بنی اسرائیل آیات ۲۲ تا ۳۹ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ہم یہاں چند خصوصیات و امتیازات کا ذکر کریں گے۔

### پہلی خصوصیت

اسلامی معاشرہ کوئی ایسا خود مختار معاشرہ نہیں ہے کہ عوام و خواص مل کر جو چاہیں کریں، ان کی مرضی قانون کا درجہ رکھتی ہو، بلکہ وہ آئین خداوندی کا پابند معاشرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے قوانین کو بدلنا تو دور کی بات ہے، کسی کو اس میں ترمیم کا حق بھی نہیں ہے۔ زندگی کا کوئی مسئلہ ہو اگر اللہ کی کتاب یا رسول اللہؐ کی سنت میں اس کا حکم یا فیصلہ موجود ہے تو اٹل ہے۔ یہ ایک ایسی بنیادی خصوصیت اور ایک ایسا جوہری امتیاز ہے جو کسی دوسرے معاشرے کو حاصل نہیں

ہے۔یہی خصوصیت دوسری تمام خصوصیات کی اصل ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ؕ (الاحزاب:۳۶)

''کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کردے تو پھر اسے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گم راہی میں پڑ گیا۔''

''یہ آیت اگرچہ ایک خاص موقع پر نازل ہوئی ہے، مگر جو حکم اس میں بیان کیا گیا ہے وہ اسلامی آئین کا اصل الاصول ہے اور اس کا اطلاق پورے اسلامی نظامِ زندگی پر ہوتا ہے۔اس کی رو سے کسی مسلمان فرد یا قوم یا ادارے یا عدالت یا پارلیمنٹ یا ریاست کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ جس معاملے میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے کوئی حکم ثابت ہو، اس میں وہ خود اپنی آزادی رائے استعمال کرے۔ مسلمان ہونے کے معنی ہی خدا اور اس کے رسول کے آگے اپنے آزادانہ اختیار سے دست بردار ہوجانے کے ہیں۔ کسی شخص یا قوم کا مسلمان بھی ہونا اور اپنے لیے اس اختیار کو محفوظ بھی رکھنا، دونوں ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں۔کوئی ذی عقل انسان ان دونوں رویوں کو جمع کرنے کا تصور نہیں کرسکتا۔ جسے مسلمان رہنا ہو اسے لازماً حکم خدا اور رسول کے آگے جھک جانا ہوگا اور جسے نہ جھکنا ہو اس کو سیدھی طرح ماننا پڑے گا کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔نہ مانے گا تو چاہے اپنے مسلمان ہونے کا وہ کتنا ہی ڈھول پیٹے خدا اور خلق خدا کی نگاہ میں وہ منافق ہی قرار پائے گا۔''

(تفہیم القرآن، ج ۴،ص ۹۷،۹۸)

## دوسری خصوصیت

اسلامی معاشرہ اپنے ایک یونٹ 'خاندان' کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ قانون شریعت کے مطابق ایک مرد اور ایک عورت کے جائز ملاپ سے ایک خاندان وجود میں آتا ہے۔ وہ ہر خاندان کے نسبی اور اخلاقی تحفظ کا اہتمام کرتا اور ہر ایسی چیز کی ممانعت کرتا ہے جس سے اس تحفظ میں خلل پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ وہ خاندان کے ہر فرد کے فرائض وحقوق کی تعین اور اس کی نگرانی کرتا ہے۔اس اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی معاشرے کی تمام یونٹ درست ہوں تو پورا

معاشرہ درست رہے گا اور اگر خاندان بگڑ جائیں تو معاشرہ بگڑ جائے گا، کیوں کہ معاشرہ خاندانوں ہی کے مجموعے کا نام ہے۔

## تیسری خصوصیت

اسلامی معاشرہ خود اپنے تمام افراد اور اپنے درمیان رہنے والے دوسرے مذاہب کے تمام افراد کی جان، مال اور آبرو کی حفاظت کرتا ہے۔ یہ حفاظت محض کتابی اور دفتری نہیں ہوتی، بلکہ عملی ہوتی ہے۔ اسلامی قوانین میں انسانی جان کے احترام کا درجہ یہ ہے کہ وہ ایک شخص کے قتل ناحق کو تمام انسانوں کا قتل قرار دیتا اور جان کے بدلے جان کی سزا مقرر کرتا ہے۔ تحفظ مال کی اہمیت یہ ہے کہ چوری کی سزا قطع ید اور رہزنی کرنے، ڈاکہ مارنے کی سزا اس سے بھی سخت ہے۔ آبرو کی حفاظت کا قانون یہ ہے کہ بعض صورتوں میں زانی اور زانیہ کو ایک سو کوڑے کی سزا دی جائے اور بعض صورتوں میں ان کو سنگ سار کر دیا جائے۔

## چوتھی جامع خصوصیت

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ ایک طرف عدل، احسان اور ادائے حقوق سے آراستہ اور دوسری طرف بے حیائی، برائی اور انسانی حقوق پر دست درازی سے خالی ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرہ ایک ایسا چمن پُر بہار ہوتا ہے جس میں انسان امن، چین اور سکون خاطر سے ہم کنار ہوتا ہے۔

یہ جو کچھ کہا گیا ہے اسلامی معاشرے کے بارے میں ہے، موجودہ دور کے مسلمان معاشرے کے بارے میں نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلامی معاشرے کے تمام افراد فرشتے ہوتے ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بحیثیت مجموعی ایک پرامن معاشرہ ہوتا ہے۔ اس معاشرے کی ہیئت اجتماعیہ بے انصافی، زیادتی اور بے حیائی کو پنپنے نہیں دیتی۔

## (۴) عورتوں کا درجہ اور ان کا مقام

پہلے گزر چکا ہے کہ اسلامی معاشرے کی ایک بنیاد ہی یہ ہے کہ عورتیں شرف انسانیت میں مردوں کے ساتھ برابر کی شریک ہیں۔ یہاں مختصر طور پر یہ کہنا ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت

سے جو فرائض وحقوق مردوں کے ہیں، وہی عورتوں کے بھی ہیں۔ اگر کچھ فرق ہے تو ان کی صنفی حیثیت اور ان کے مخصوص مسائل کی وجہ سے ہے۔ اللہ و رسول کی کامل اطاعت مردوں پر بھی فرض ہے اور عورتوں پر بھی۔ اس اطاعت کی جزا بھی دونوں کی ایک ہی ہے۔ اسی اطاعت کامل کی فرع دعوت وتبلیغ اور اقامت دین کی جدو جہد بھی ہے۔

## (۵) عورتوں کا دائرۂ کار

مسلمان خواتین کا دائرۂ کار اصلاً ان کا گھر ہے۔ پردہ اور حجاب ان کی عفت وعصمت کے ایک محافظ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی تحفظ کے لیے ان کو مجلسوں، محفلوں، تعلیم گاہوں، یہاں تک کہ مسجدوں میں بھی مردوں کے ساتھ اختلاط سے روک دیا گیا ہے۔ اسی سے معلوم ہوا کہ ان کی دعوت وتبلیغ کا دائرہ بھی اصلاً خواتین ہی کے اندر ہے۔

## (۶) مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں

اوپر جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ دراصل علمی تیاری کی طرف ایک اشارہ ہے۔ جب تک کوئی شخص، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اس اسلام کو جان نہ لے جو اس پر ذمہ داریاں عائد کرتا ہے وہ اپنی ذمہ داریوں کو صحیح طور پر ادا نہیں کرسکتا۔

### پہلی ذمہ داری

غیر مسلم معاشرے میں مسلمان خواتین کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ خود اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے والی اور اسلام کا ایک چلتا پھرتا نمونہ ہوں۔ وہ جن غیر مسلم خواتین کو اسلام کی دعوت دیں گی وہ ان کے قول کو ان کے عمل سے جانچیں گی اور یہ دیکھیں گی کہ وہ جس اسلام کی دعوت دے رہی ہیں اس پر خود ان کا عمل کتنا اور کیسا ہے۔

### دوسری ذمہ داری

ان کی دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے گھر کو بھی اسلامی معاشرے کا ایک نمونہ بنائیں۔ ان کے بچوں کی تعلیم وتربیت، ان کا رہن سہن، ان کے گھر کی فضا اور اس کی پاکی و

پاکیزگی سب کچھ اسلامی تعلیمات کے مطابق ہو۔ اگر ان کے شوہر یا والدین اور بھائی بہن اسلام کو جاننے والے اور اس پر عمل کرنے والے ہوں تو ان کو فریضۂ تبلیغ کی طرف متوجہ کرنا اور اس معاملے میں ہر طرح سے ان کا تعاون کرنا چاہیے اور اگر خدانخواستہ یہ لوگ نہ اسلام کو جانتے ہوں اور نہ اس پر عمل کرتے ہوں تو سب سے پہلے حدود ادب کے اندر رہ کر انہی لوگوں پر تبلیغ کرنی چاہیے۔ یہ دونوں ذمہ داریاں اس آیت کریمہ میں موجود ہیں:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ (التحریم:۶)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے جن کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے، جس پر نہایت تندخو اور سخت گیر فرشتے مقرر ہوں گے جو کبھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انھیں دیا جاتا ہے اسے بجالاتے ہیں۔''

''یہ آیت بتاتی ہے کہ ایک شخص کی ذمہ داری صرف اپنی ذات ہی کو خدا کے عذاب سے بچانے کی کوشش تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ نظام فطرت نے جس خاندان کی سربراہی کا بار اس پر ڈالا ہے اس کو بھی وہ اپنی حد استطاعت تک ایسی تعلیم و تربیت دے جس سے وہ خدا کے پسندیدہ انسان بنیں اور اگر وہ جہنم کی راہ پر جا رہے ہوں تو جہاں تک بھی اس کے بس میں ہو، ان کو اس سے روکنے کی کوشش کرے۔ اس کو صرف یہی فکر نہیں ہونی چاہیے کہ اس کے بال بچے دنیا میں خوش حال ہوں، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اسے یہ فکر ہونی چاہیے کہ وہ آخرت میں جہنم کا ایندھن نہ بنیں۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے ہر ایک راعی ہے اور ہر ایک اپنی رعیت کے معاملہ میں جواب دہ ہے۔ حکمراں راعی ہے اور وہ اپنی رعیت کے معاملہ میں جواب دہ ہے۔ مرد اپنے گھر والوں کا راعی ہے اور وہ ان کے بارے میں جواب دہ ہے اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور بچوں کی راعی ہے اور وہ ان کے بارے میں جواب دہ ہے۔'' (تفہیم القرآن ج ۶ ص ۲۹)

## تیسری ذمہ داری

مسلمان خواتین کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ ان عقائد، نظریات، افکار و خیالات کی واقفیت حاصل کریں جن پر موجودہ مغربی معاشرے کی تعمیر ہوئی ہے اور جس نے عریانی، بے حیائی اور اباحیت کا طوفان برپا کر رکھا ہے۔ جس نے خاندان کے نظام کو تتر بتر کر دیا ہے اور جس نے دنیا بھر پر بدامنی، بے چینی اور جنگ وجدال کا عذاب نازل کر رکھا ہے۔ یہ تقابلی مطالعہ دعوت و تبلیغ میں بہت کار آمد ثابت ہوگا۔ وہ اسلامی عقائد و نظریات پیش کر کے اس کے فوائد بتا سکیں گی اور ملحدانہ عقائد و نظریات کے نقصانات واضح کر سکیں گی، غیر مسلم خواتین کو یہ سمجھا سکیں گی کہ اسلام پوری دنیا کے لیے ایک نظام رحمت ہے۔

## چوتھی ذمہ داری

دعوت و تبلیغ اور اعلائے کلمۃ اللہ کا فریضہ جماعتی سعی اور تنظیم کا تقاضا کرتا ہے اس لیے ان کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ ہم خیال خواتین کی ایک تنظیم قائم کریں اور منظم طور پر یہ خدمت انجام دیں۔ کلمۃ اللہ کی سربلندی کی جدوجہد میں خواتین کی تنظیم مردوں کی تنظیم کا ہاتھ بٹائے گی اور بہترین معاون ثابت ہوگی۔ قرآن کریم میں واضح کیا گیا ہے کہ مشرک مرد اور مشرک عورتیں، منافق مرد اور منافق عورتیں شرک اور نفاق کو پھیلانے اور پروان چڑھانے میں ایک دوسرے کے مددگار رہیں۔ منافقین و منافقات کے مقابلے میں مومنین و مومنات کا حال بھی بیان کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

(التوبۃ: ۷۱، ۷۲)

''مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی، یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے۔ ان مومن مردوں اور عورتوں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انھیں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان سدا بہار باغوں میں ان کے لیے پاکیزہ قیام گاہیں ہوں گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کی خوش نودی انھیں حاصل ہوگی۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔''

ان دو آیتوں سے دو باتیں صراحت کے ساتھ ثابت ہوئیں: ایک یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے میں مومن عورتیں، مومن مردوں کی شریک کار ہوتی ہیں۔ اسی طرح اقامت صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ اور اطاعت خدا و رسول یعنی پورے دین پر عمل کرنے میں عورتیں مردوں کی ساتھی ہوتی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ مومن مردوں اور مومن عورتوں کا صلہ بھی ایک ہی ہے۔

یہ مختصر مقالہ ایک متن کی حیثیت رکھتا ہے، جس کی تشریح کسی طویل مقالے سے کی جا سکتی ہے۔

(ماہ نامہ زندگی نو نئی دہلی، جنوری ۱۹۸۵ء)

# حضرت ابراہیمؑ کا اسوہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی اور راہ حق میں ان کی فداکاری کو ایک لفظ میں سمیٹنا ممکن ہو تو اس کے لیے 'قربانی' سے بہتر لفظ شاید ہی مل سکے۔ چار ہزار برس پہلے شہر اُر کا مقدس ترین انسان، جس نے اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ لٹا دیا، قربان کر دیا۔

یہ تھے حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسّلام۔

اُر اس عہد کے جاہلی تمدن کا نمائندہ شہر، وقت کی مادی تہذیب کا معیاری نمونہ، ننّار (چاند دیوتا) کی مملکت کا پایۂ تخت، جس کی نیابت، نمرود کا شاہی خاندان کرتا تھا، وہ نمرود جس کی حکومت، جبر وقہر کا لاجواب ماڈل تھی۔ وہ نمرود جس کی صف میں آگے چل کر فرعون نے نمایاں مقام حاصل کیا ـــــ ننّار کا بت خانہ، اُر کی سب سے اونچی پہاڑی پر پتھر کی عالی شان عمارت تھی، ایک پورا محل، جسے شاہی محل سرا کہنا چاہیے۔ جس پر ملک کی سینکڑوں کنواریاں وقف تھیں، تاکہ ہر رات ان میں کی ایک چاند دیوتا کی خواب گاہ میں دلہن بنے۔ جہاں عورت کا کسی اجنبی کے لیے اپنا گوہر عصمت لٹانا ذریعہ نجات تھا۔ وہ محل سرا پجاریوں کی صرف عیش گاہ ہی نہ تھی، مملکت کی سب سے بڑی عدالت بھی تھی، جس کا فیصلہ، خدا کا فیصلہ تھا۔ پجاریوں کے گروہ اور شاہی خاندان کو خدا کا درجہ حاصل تھا اور دوسرے تمام باشندے ان کے بندے تھے۔ ان انسانی معبودوں میں سب سے بڑا نمرود تھا، ننار کا اوتار اور اس کا نائب۔ باشندگان ملک کا کام یہ تھا کہ اس خدا کے چرنوں میں اپنا سب کچھ لٹائیں اور اس خدا کا کام یہ تھا کہ ان کے سروں پر

اپنی خدائی کا تخت بچھائے ـــــ یہ نقشہ تھا کہ اس مملکت کے سب سے بڑے افسر کے گھر میں، حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے۔

خالص مشرکانہ ماحول اور مادیت میں ڈوبی ہوئی فضا میں انھوں نے آنکھ کھولی۔ ہر طرف سورج، چاند اور دوسرے تاروں کی خدائی کے ڈنکے بج رہے تھے۔ انسان کے جذبۂ عبودیت کی تسکین کے لیے بت، مجسمے، پجاری اور بادشاہ حاضر تھے اور اس کی حیوانیت کی آسودگی کے لیے صنعت، تجارت، شراب اور عورت موجود تھی۔ قحبہ گری اور بدکاری رائج ہی نہ تھی، بلکہ اس کو مذہب اور سیاست دونوں کی سندِ جواز حاصل تھی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر جیسے جیسے شعور وادراک کی سرحدوں کو چھو رہی تھی ویسے ویسے ان کے اندر ماحول کے خلاف جذبات بیدار ہو رہے تھے۔ اچھے ماحول سے اثر پذیری تو ایک عام بات ہے، اس میں کوئی خصوصیت نہیں، لیکن جب ہادیِ مطلق کی رحمت جوش میں آتی ہے تو وہ کفر وشرک اور معصیت کی کالی اور بھیانک رات میں ہدایت اور نیکی واطاعت کا چراغ روشن فرما دیتا ہے۔ گم راہ انسانوں کے درمیان ایک ایسے فرد کو نشو ونما دیتا ہے جس کی فطرتِ سلیم پر ماحول کی کوئی بیماری اثر انداز نہیں ہوتی، بلکہ وہ بیمار ماحول کے لیے طبیب حاذق بن جاتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی اللہ نے نبوت ورسالت کے لیے چن لیا تھا۔ شہر اُر کا سڑا ہوا ماحول انھیں متاثر نہ کر سکا۔ ننار کا دیوہیکل بت اور اس کی بیوی نن گل کا حسین مجسمہ، انھیں انسانی ہاتھ کا ایک کھیل، ایک تماشا اور ایک مذاق نظر آیا۔

ان کی متجسس نگاہوں نے چاند اور سورج کا جائزہ لیا اور وہ اس حقیقت کو پا گئے کہ یہ خدا تو کیا ہوتے انسانوں سے بھی زیادہ مجبور و بے بس ہیں۔ یہ خود ایک ایسے قانون میں جکڑے ہوئے ہیں کہ بال برابر بھی اس سے ہٹ نہیں سکتے۔ آخر کار وہ چاند اور سورج ہی کو زینہ بنا کر اس بارگاہ قدس میں پہنچ گئے جو پوری کائنات کا مرکز ہے۔ ان کی روح فرطِ مسرت سے جھوم اٹھی اور زبان سے بے ساختہ نکلا:

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا

وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ o (الانعام:۷۹)

''میں نے یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں ہر گز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔''

آج ہم حضرت ابراہیمؑ کے اس اعلان کو ایک سیدھا سادہ اور ٹھنڈا اعلان سمجھتے ہیں، لیکن جس قوم، جس ملک اور جس سوسائٹی میں کھڑے ہو کر انھوں نے یہ اعلان کیا تھا اس نے اس کو اپنے خلاف ایک زلزلہ انگیز اور شعلہ فشاں نعرہ قرار دیا تھا، اس لیے کہ اس نے اس کا مطلب یہ سمجھا تھا کہ ابراہیمؑ اپنے اس اعلان کے ذریعہ اپنا رخ ستّار سے موڑ رہے ہیں، پجاریوں کے گروہ سے موڑ رہے ہیں، نمرود سے موڑ رہے ہیں، شاہی خاندان سے موڑ رہے ہیں، وقت کے قانون سے موڑ رہے ہیں، خاندانی رسم ورواج سے موڑ رہے ہیں اور ہر اس چیز سے موڑ رہے ہیں جو فاطر السموات والارض کی طرف رخ سیدھا کرنے میں حائل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اسے خاموشی کے ساتھ نہیں سنا، بلکہ حسب دستور قدیم وہ پہلے اس اعلان کے مقابلے میں 'حجت بازی' پر اتر آئی۔ قرآن کہتا ہے: وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ''اور اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی۔'' اس کے حافظے سے خالق کائنات کی یاد، اس کی عظمت، اس کی یکتائی اور اس کے حقوق اس طرح محو ہو چکے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعوت توحید بالکل اُپری، نرالی، اجنبی اور نئی نظر آئی۔ اس نے کہا: تم یہ کیا بات اپنے منہ سے نکال رہے ہو، کیا تم چاند دیوتا سے نہیں ڈرتے؟ کیا تمھیں اپنے باپ کا عہدہ یاد نہیں رہا؟ کیا تم نمرود کے قہر وغضب سے بے پروا ہو گئے؟ انھوں نے کہا: خوب! تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک قرار دے رہے ہو، جس کی کوئی دلیل وسند تمھارے پاس نہیں ہے اور مجھے ان بے سند چیزوں سے ڈرا رہے ہو۔ میں خدا کے مقابلے میں ان سے کس دلیل کی بنا پر ڈروں؟ تم خود سوچو کہ ہم دونوں میں کون فریق امن واطمینان اور بے خوفی کا زیادہ مستحق ہے؟ ان کی اس بات کا قوم کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ ان کی دعوت توحید سے خود ان کے گھر میں بھونچال آ گیا۔ پوری قوم میں کھلبلی مچ گئی اور نمرود کا دربار بھی دہل گیا اور پھر وہ سب کے سب ان کے مقابلے میں صف بستہ ہو گئے۔ انھوں نے اپنی سطح بینی کی وجہ سے

یہ سمجھا کہ وہ یکہ وتنہا ہیں، انھیں دبالینا کیا مشکل ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھ سکے کہ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ خدا ہے، جس کے لشکر کی تعداد کوئی گن نہیں سکتا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوتِ توحید بھی جاری رہی اور قوم سے بحث ومناظرہ بھی ہوتا رہا۔ ایک بار انھوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا: یہ مورتیں کیا ہیں جن کے گرد تم لوگ جمع رہتے ہو اور جن کے اس قدر گرویدہ ہو؟ گزشتہ مشرک قوموں کی طرح ان کی قوم کے پاس بھی اس شرک کے لیے تقلید آباء کے سوا کوئی دلیل نہ تھی۔ انھوں نے جواب میں یہی دلیل دی کہ ''ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے پایا ہے'' ــــــ اب وقت آ گیا تھا کہ قوم سے صاف صاف کہہ دیا جائے کہ جن آباء واجداد کی دلیل تم پیش کرتے ہو وہ سب گم راہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے کہا: ''تم بھی گم راہ ہو اور تمھارے باپ دادا بھی صریح گم راہی میں پڑے ہوئے تھے۔'' یہ سن کر ان کی قوم گویا بھونچکا ہو گئی۔ اس کے تصور میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ کوئی شخص خود اپنے باپ دادا کو گم راہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ اس نے حیرت کے ساتھ پوچھا: ''کیا تو ہمارے سامنے سنجیدہ اور واقعی بات کہہ رہا ہے یا مذاق کرتا ہے؟'' قوم کا سوال یہ بتا رہا ہے کہ وہ باپ دادا کو گم راہ کہنے کی بات کو سنجیدگی اور حقیقت سے دور سمجھتی تھی۔ انھوں نے اپنی قوم سے کہا: نہیں، یہ مذاق نہیں ہے ''بلکہ فی الواقع تمھارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب اور ان کا پیدا کرنے والا ہے، اس پر میں تمھارے سامنے گواہی دیتا ہوں۔'' لیکن پشت ہا پشت سے مورتیوں کے بارے میں جو عقیدہ جمایا گیا تھا وہ کب مٹنے والا تھا، اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے محسوس فرمایا کہ اب عملی مظاہرہ کر کے قوم کے سامنے مورتیوں کی بے بسی واضح کی جائے۔ انھوں نے قوم سے کہا:

''اور خدا کی قسم میں تمھاری غیر موجودگی میں ضرور تمھارے بتوں کی خبر لوں گا۔''

سالانہ جشن کے موقع پر انھوں نے اپنی اسکیم پر عمل کر کے دکھایا۔ جشن شہر کے کسی میدان میں منایا جاتا تھا، انھیں بھی اس میں شرکت کی دعوت دی گئی، لیکن انھوں نے اپنے بارے میں ایک ایسی بات کہی کہ دعوت دینے والوں نے انھیں شرکت سے معذور سمجھ لیا اور انھیں تنہا چھوڑ کر سب لوگ جشن منانے چلے گئے۔ اس تنہائی سے فائدہ اٹھا کر وہ بت خانے میں گھس گئے اور

ایک بڑے بت کے سوا تمام بتوں کو توڑ پھوڑ دیا۔ چوں کہ انبیاء کرام دعوت وتبلیغ اور اس سے متعلق تمام امور، براہِ راست، اللہ کی نگرانی میں انجام دیتے ہیں، اس لیے بلاشبہہ یہ بہت بڑا عملی اقدام انھوں نے اللہ کے اذن ہی سے کیا تھا۔ اس عملی اقدام سے ان کی دعوت توحید پوری قوم کے سامنے ایک ایسی دلیل کے ساتھ ثابت ہوگئی جسے وہ اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بت جن کے بارے میں یہ عقیدہ پھیلایا گیا تھا کہ وہ خدا کی خدائی میں شریک اور صاحبِ اختیار ہیں، اس کی آنکھوں کے سامنے ٹوٹے پھوٹے پڑے تھے، شرک کا طلسمِ باطل ہو چکا تھا اور سردارانِ قوم کی گردنیں، ذلت ورسوائی کے احساس سے جھکی ہوئی تھیں، لیکن جب اٹھیں تو ان کی پیشانیوں پر عرقِ انفعال کے بجائے انتقام کی سلوٹیں اور ان کے چہروں سے غصے کی آگ برس رہی تھی۔ ہر ایک چہرا لال بھبوکا بنا ہوا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خاندانی جاہ ومنصب اور عیش وآرام پر تو اسی دن لات ماردی تھی جب انھوں نے وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ کا اعلان کیا تھا اور اب ان کے سامنے خدا کی خوش نودی اور اس کے دین کی سربلندی کے لیے ایثار وقربانی کی ایک ایسی راہ کھل گئی تھی، جس میں انھیں اپنا سب کچھ لٹا دینا تھا۔ چنانچہ وہ بت شکنی کی پاداش میں جیل میں ڈال دیے گئے اور ان کا مقدمہ خود ان کے باپ نے، جو حکومت کا سب سے بڑا عہدہ دار تھا، نمرود کے سامنے پیش کیا۔ اس کی کونسل نے فیصلہ کیا کہ مجرم کو آگ کے اَلاؤ میں ڈال دیا جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پہلے سے معلوم ہوگا کہ اس 'جرم عظیم' کی سزا کیا ہوسکتی ہے، اس لیے انھوں نے یہ فیصلہ بڑے اطمینان سے سنا ہوگا۔ اللہ کی راہ میں جاہ ومنصب اور عیش وآرام کی قربانی کے بعد یہ جان کی قربانی تھی۔

جس خدا کے لیے انھوں نے یہ قربانی دی تھی وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ابراہیم اس آزمائش میں پورے اترتے ہیں یا نہیں؟ جب آگ کے دہکتے ہوئے الاؤ میں وہ ڈال دیے گئے تو آزمائش پوری ہوگئی اور پھر پدر ابراہیم کی قساوت قلبی نے، نمرود کی جھوٹی خدائی نے اور باغی قوم کی تماشہ بیں نگاہوں نے خدائے قادر وتوانا کا یہ ادنیٰ کرشمہ دیکھا:

قُلۡنَا یٰنَارُ كُوۡنِیۡ بَرۡدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰۤى اِبۡرٰهِیۡمَ ۙ (الانبیاء:۶۹)

''ہم نے کہا: اے آگ! ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیم پر۔''

اور دوسرے لمحے دہکتے ہوئے شعلوں کا الاؤ مہکتے ہوئے پھولوں کا باغ بن گیا۔ اندازہ لگایئے کہ جب وہ ہنستے ہوئے آگ سے باہر آئے ہوں گے تو نمرود اور اس کے پجاریوں کے چہروں کا رنگ، کس تیزی سے بدل گیا ہوگا۔ آخرت میں تو وہ چہرے سیاہ ہوں گے ہی، اس دنیا میں بھی ذلت و رسوائی کے احساس سے سیاہ پڑ گئے ہوں گے۔ قرآن نے کہا:

وَ اَرَادُوۡا بِهٖ كَیۡدًا فَجَعَلۡنٰهُمُ الۡاَخۡسَرِیۡنَ ۚ (الانبیاء:۷۰)

''وہ چاہتے تھے کہ ابراہیم کے ساتھ برائی کریں، مگر ہم نے بری طرح ان کو ناکام کر دیا۔''

جان کی قربانی اگرچہ بہت مشکل کام ہے، یہ آخری نذرانۂ عبدیت ہے جو بندۂ محتاج اپنے غنی و حمید آقا کے حضور پیش کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود چند لمحے کی بات ہے اور ہجرت، جلاوطنی، ترکِ وطن اگرچہ آخری نذرانۂ عبدیت نہیں، لیکن وہ کوئی لمحاتی چیز نہیں ہے۔ خدا کے لیے اس جگہ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینا، جس کی محبت طبعی طور پر انسان کے اندر رچی بسی ہوتی ہے، ایک طویل اور صبر آزما قربانی ہے، بلکہ وہ قربانیوں کا ایک لمبا سلسلہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی راہ میں یہ قربانی بھی دی۔ ان کا باپ جو اپنا سرکاری منصب بچانے کے لیے انھیں آگ کے حوالے کرنے سے بھی باز نہ آیا وہ کس طرح برداشت کر سکتا تھا کہ اس کا 'باغی' بیٹا اپنی 'خطرناک' دعوت پھیلاتا رہے، چنانچہ ایک دن اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ تم میرے پاس سے چلے جاؤ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ بیٹے کی تمام توحید پرستی میرے اور میرے گھر کے سہارے چل رہی ہے۔ گھر میں کھانے کو مل جاتا ہے اور آرام سے قیام کی جگہ مہیا ہے، اس لیے یہ تمام دعوتی بلند پروازیاں ہیں، جب گھر سے نکالے جائیں گے تو پتہ چلے گا کہ آٹے دال کا بھاؤ کیا ہے۔ شرک اور حبِ دنیا نے اس کے دل کی آنکھوں کو اندھا کر دیا تھا، اس لیے وہ ایمان باللہ کی طاقت کو محسوس نہیں کر سکا ـــــ شہر اُر کی پوری آبادی میں سے صرف حضرت لوطؑ نے، جو حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے، ان کی پیروی اختیار کی اور چوں کہ حضرت لوطؑ کو بھی اللہ تعالیٰ نے نبوت عطا

کی، اس لیے کہنا چاہیے کہ عام آبادی سے کوئی ایک شخص بھی حضرت ابراہیمؑ پر ایمان نہ لایا۔ وقت آ گیا تھا کہ وقت کا نبی، شرک اور اہل شرک سے براءت و بیزاری کا اعلان کر کے ہجرت اختیار کر لے، چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی راہ میں اپنے وطن کو بھی قربان کر دیا۔ ہجرت سے پہلے انھوں نے شرک و اہل شرک سے براءت کا جو اعلان کیا تھا اسے قرآن نے متعدد مقامات پر نقل کیا ہے لیکن سورۂ ممتحنہ کے الفاظ اپنی ایک خاص شان رکھتے ہیں۔ اس سورہ کی آیت ۴، ۵، ۶ سامنے رکھیے۔ میں آیت ۴ کا ایک ٹکڑا یہاں نقل کرتا ہوں:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ (الممتحنہ: ۴)

”تمھارے لیے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے، جب کہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا تھا: ہم تم سے اور ان تمام چیزوں سے جنھیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، بالکل بری ہیں، ہم نے تمھارا انکار کیا اور ہمارے اور تمھارے درمیان عداوت اور نفرت ہمیشہ کے لیے آشکار ہوگئی، یہاں تک کہ تم اللہ واحد پر ایمان لاؤ۔“

اور پھر وہ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (میں وطن چھوڑ کر اپنے رب کی طرف جاتا ہوں بلاشبہہ وہ غالب و حکیم ہے) اور اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ (میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں، وہ میری رہبری فرمائے گا) کہتے ہوئے اپنے وطن سے نکل گئے، بایں حال کہ ان کے ساتھ ان کی بیوی حضرت سارہ اور بھتیجے حضرت لوط کے سوا کوئی نہ تھا۔ خدا پر توکل اور اس کی راہ میں قربانی کی یہ ایک بے نظیر مثال تھی، ان کی قوم نے اور خود ان کے باپ نے اپنے 'باغی' بیٹے کی بے بسی و بے کسی پر شاید تالی پیٹ دی ہوگی، کیوں کہ اسے معلوم نہ تھا کہ جس بیٹے کو وہ یکہ و تنہا سمجھ رہا ہے اس کی ذات میں پوری ایک امت چھپی ہوئی ہے اور اس کی پشت پر اللہ اور اس کا بے شمار لشکر ہے۔

آزمائشوں کی اس بھٹی سے کندن کی طرح نکلنے کے باوجود ابھی ایک آزمائش اور باقی تھی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنا سب کچھ قربان کر چکے تھے، لیکن ابھی ایک اور عظیم قربانی وقت کی منتظر تھی۔ وطن سے نکلنے کے بعد اللہ نے انھیں اس سے زیادہ سرسبز وشاداب اور بابرکت خطے میں بسایا، زمین دی، مال واسباب دیے اور امن وسکون عطا فرمایا اور پھر بڑھاپے میں حضرت اسمٰعیلؑ جیسا فرزند عطا فرمایا۔ بوڑھے باپ کو اپنے اکلوتے اور لائق فرزند سے جو محبت ہوگی وہ کوئی ناقابل تصور شے نہیں ہے، آج بھی اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جب یہ لائق فرزند اس لائق ہوا کہ زندگی کے کاروبار میں اپنے باپ کا مددگار بنے تو اللہ کی طرف سے حکم آیا کہ ابراہیم خود اپنے ہاتھ سے اس بیٹے کو ذبح کر دیں۔ العظمۃ للہ۔ یہ ایک ایسی آزمائش تھی کہ اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی آزمائشوں کی پوری تاریخ اس کی مثال سے خالی ہے۔ یہ اپنے پورے حقیقی معنی کے لحاظ سے بے نظیر آزمائش تھی، جو صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے خاص کر دی گئی تھی۔

یہ ابتلا تھی براہیم کے لیے مخصوص　　خود اپنے ہاتھ سے اپنے پسر کی قربانی

انھوں نے اپنے اکلوتے سے کہا: بیٹے خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں، غور کر کے بتا، تیری کیا رائے ہے؟ بیٹے نے جواب میں کہا۔ ابا آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر گزریے۔ ان شاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے ـــــ چار ہزار برس پہلے کے اس ہیبت ناک اور اضطراب انگیز منظر سے تصور کی آنکھیں بھی پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں جب خدا کے ایک بندے نے اپنے آقائے ولی نعمت کے حکم سے اپنے لائق ترین اکلوتے بیٹے کی گردن پر چھری چلا دی۔ ایک ایسا حکم جو نہ ابراہیم سے پہلے کسی کو دیا گیا اور نہ ان کے بعد۔ بے شک خدا کی محبت میں قربانی دینے والے بہت سے افراد، تاریخ کے اسٹیج پر متحرک نظر آتے ہیں، لیکن خود تاریخ گواہ ہے کہ اس نے ان دو باپ بیٹوں کی قربانی سے بڑی قربانی کبھی نہیں دیکھی۔

بندہ جب اس بے نظیر آزمائش میں پورا اتر گیا تو اس کے آقائے ولی نعمت نے جو اجر اُسے عطا کیا وہ بھی بے نظیر تھا۔ نبوت ورسالت، جو اس کائنات میں سلطان کائنات کی طرف سے دیے ہوئے مناصب میں مقدس ترین وعظیم ترین منصب ہے، ذریت ابراہیم کے لیے خاص کر دی گئی۔ باپ خلیل اللہ کے لقب سے ملقب ہوئے اور بیٹا ذبیح اللہ قرار پایا۔ ان دونوں پر

نعمتوں، رحمتوں اور برکتوں کا وہ بادل برسا کہ نہال ہو گئے، باغ باغ ہو گئے اور دونوں نے اپنے آقا کے حضور شکر گزار پیشانیاں جھکا دیں۔ پھر خدا نے چاہا کہ اس بے نظیر قربانی سے جو 'اسلام' کا معیاری نمونہ ہے، دوسرے بندے بھی فیض پائیں تو اس نے اس دن کو قیامت تک کے لیے یادگار دن اور اس قربانی کو قیامت تک کے لیے یادگار قربانی بنا دیا۔ ہم اور آپ یوم النحر میں جو جانور قربان کرتے ہیں وہ اسی عظیم واقعے کی یادگار اور اس کا ایک پرتو ہے۔

ہر سال اس عظیم واقعے کے یادگار ایام آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ ہم عید الاضحیٰ کی نماز پڑھتے ہیں، صاحب نصاب افراد کی ایک بڑی تعداد قربانی کرتی ہے، تین دنوں تک ہم گوشت کھانے اور کھلانے کے جشن مناتے ہیں اور رسائل واخبارات کے مدیر اس واقعے پر اداریے لکھتے اور مقالات شائع کرتے ہیں اور بات ختم ہو جاتی ہے۔ نماز عید اور قربانی سے جو اصل فائدہ ہمیں حاصل کرنا چاہیے وہ شاید ہی کچھ خوش نصیب افراد حاصل کرتے ہوں۔ اصل فائدہ یہ ہے کہ ہم اپنی ایمانی حالت اور اپنے اخلاق وکردار کا، اس عظیم واقعے کی روشنی میں جائزہ لیں۔ حضرت ابراہیم واسمٰعیل علیہما السّلام کے آئینۂ ایمان وعمل میں اپنے ایمان وعمل کا عکس دیکھنے کی کوشش کریں۔ سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ اس پر غور کریں کہ اسوۂ ابراہیمی پر عمل کے معاملے میں ہمارا حال کیا ہے؟ کیا اس واقعے کی یاد سے ہمارے دلوں میں محبت الٰہی کا کوئی جذبہ اور ہمارے سروں میں کلمۂ توحید کو سر بلند کرنے کا کوئی سودا پیدا ہوتا ہے؟

آنے کو تو آتی ہیں جنوں خیز بہاریں
کیا جانیے اب کیوں ہمیں سودا نہیں ہوتا

(ماہ نامہ زندگی رام پور، مئی ۱۹۶۳)

# انبیائی دعوت کا ایک اسلوب

انبیاء کرامؑ نے دعوت حق کو قبول کر لینے کی ترغیب کے لیے اپنے مخاطبین کے سامنے اس کے مادی فوائد بھی پیش کیے ہیں۔ انھوں نے صرف روحانی فوائد اور اخروی نجات و کامیابی کے بیان پر اکتفا نہیں کیا ہے۔ انبیاء اولوالعزم میں سب سے پہلے نبی، جن کی دعوت تفصیل سے قرآن مجید میں پیش کی گئی ہے، وہ حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔ سورۂ نوح پوری کی پوری ان کی دعوت، دعوتی جدوجہد کی روداد، دعوت کے طریقے اور اس کے متعلقات پر مشتمل ہے۔ وہ اپنی دعوتی جدوجہد کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ثُمَّ اِنِّیْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَ اَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًاۙ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًاۙ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًاۙ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًاؕ (نوح:۹-۱۲)

”پھر میں نے ان کو کھول کر کہا اور چھپ کر کہا چپکے سے، تو میں نے کہا: گناہ بخشواؤ اپنے رب سے، بے شک وہ ہے بخشنے والا۔ چھوڑ دے گا آسمان کی تم پر دھاریں اور بڑھا دے گا تم کو مال اور بیٹوں سے اور بنا دے گا تمھارے واسطے باغ اور بنا دے گا تمھارے لیے نہریں۔“

ان آیات میں مادی فوائد کی جو فہرست پیش کی گئی ہے وہ کسی تشریح کی محتاج نہیں ہے۔ پھر بھی میں، مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنے حاشیۂ قرآن میں جو تشریح کی ہے، وہ یہاں نقل کرتا ہوں:

''یعنی ایمان و استغفار کی برکت سے قحط وخشک سالی (جس میں وہ برسوں سے مبتلا تھے) دور ہوجائے گی اور اللہ تعالیٰ دھواں دھار برسنے والا بادل بھیج دے گا، جس سے کھیت اور باغ خوب سیراب ہوں گے، غلّے پھل اور میوہ کی افراط ہوگی، مواشی وغیرہ فربہ ہوجائیں گے، دودھ گھی بڑھ جائے گا اور عورتیں جو کفر و معصیت کی شامت سے بانجھ ہورہی ہیں، اولاد ذکور جننے لگیں گی۔ غرض آخرت کے ساتھ دنیا کے عیش و بہار سے بھی وافر حصہ دیا جائے گا۔''

انبیاء کرامؑ نے اپنی دعوت پیش کرتے ہوئے اپنے مخاطبین کو مادی فوائد کی ترغیب دی تھی یا نہیں؟ اس کا جواب معلوم کرنے کے لیے یہی آیتیں کافی ہیں اور ایک داعیِ حق کے اطمینان کے لیے بھی یہی آیتیں کافی ہیں۔ اب اگر کوئی عالم باعمل طریق دعوت میں مادی فوائد پیش کرنے کو ذہنی رشوت قرار دے کر اس کا انکار کرے تو اس کا یہ انکار قابل انکار ہوگا یا نہیں؟! یہ حقیر سمجھتا ہے کہ مذکورہ بالا مقرر نے اپنے ذوق جدید کے غلبے اور بے شعوری کی حالت میں ایسی بات کہہ دی ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں معاف فرمائے۔

حضرت ہود علیہ السلام کی دعوتی جدوجہد کا قرآن کریم میں مطالعہ کیجیے۔ انھوں نے بھی اپنے مخاطبین سے کہا تھا:

وَ يٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ يَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ۝ (ہود:۵۲)

''اور اے میری قوم! گناہ بخشواؤ اپنے رب سے، پھر رجوع کرو اس کی طرف، چھوڑے گا تم پر آسمان سے دھاریں اور زیادہ دے گا تم کو زور پر زور اور روگردانی نہ کرو گنہ گار ہوکر۔''

آیت کے دوسرے ٹکڑے کی تشریح کرتے ہوئے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:

''یعنی مالی و بدنی قوت بڑھائے گا، اولاد میں برکت دے گا، خوش حالی میں ترقی ہوگی، اور مادی قوت کے ساتھ روحانی و ایمانی قوت کا اضافہ کردیا جائے گا، بہ شرطے کہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرو، اس کی اطاعت سے مجرموں کی طرح روگردانی نہ کرو۔''

(حاشیہ عثمانی)

سورۂ نوح اور سورۂ ہود کی آیتوں کا ایک پہلو تو یہ قابل غور ہے کہ ان میں کفر وشرک سے استغفار اور رجوع الی اللہ کے صرف مادی فوائد پیش کیے گئے ہیں اور مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے سورۂ ہود کی ان آیتوں کی جو تشریح کی ہے اس سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ مخاطبین کی دل چسپی اور ضرورت کے لحاظ سے مادی فوائد پیش کیے گئے ہیں۔ یہ حکمت تبلیغ کی ایک اہم بات ہے، جس سے ہر داعیِ حق کو فائدہ اٹھانا چاہیے، یعنی مخاطبین کی دل چسپی اور ان کی ضرورتوں کے لحاظ سے ظاہری، دنیوی اور مادی فوائد پیش کرنے چاہئیں۔ مثال کے طور پر اس وقت ہمارے ملک میں بدامنی پھیلی ہوئی ہے، کرپشن غالب ہے اور امیروں اور غریبوں کے درمیان بے حد تفاوت کی وجہ سے کش مکش جاری ہے۔ اب اگر داعی حق یہ کہتا ہے کہ اسلام تمھارے مسائل کا واحد حل ہے، اگر تم اسلام قبول کرلو اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو تو ملک میں امن وامان کی بہار آجائے گی، اچھے اخلاق وکردار کے چمن لہلہا اٹھیں گے اور امیروں اور غریبوں کے درمیان کش مکش ختم ہو جائے گی تو یہ بات نہ صرف جائز، بلکہ اس حکمت تبلیغ کے مطابق ہوگی جو انبیاء کرام نے سکھائی ہے۔

سورۂ ہود کی ابتدائی چار آیتوں میں قرآن نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے جو دعوت پیش کی ہے وہ یہ ہے:

الٓرٰ قف کِتٰبٌ اُحۡکِمَتۡ اٰیٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتۡ مِنۡ لَّدُنۡ حَکِیۡمٍ خَبِیۡرٍۙ ۝ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِیۡ لَکُمۡ مِّنۡهُ نَذِیۡرٌ وَّ بَشِیۡرٌۙ ۝ وَ اَنِ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّکُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَیۡهِ یُمَتِّعۡکُمۡ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی وَّ یُؤۡتِ کُلَّ ذِیۡ فَضۡلٍ فَضۡلَهٗ ؕ وَ اِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ کَبِیۡرٍ ۝ اِلَی اللّٰهِ مَرۡجِعُکُمۡ ۚ وَ هُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۝ (ہود:۱-۴)

”ال ر۔ فرمان ہے، جس کی آیتیں پختہ اور مفصل ارشاد ہوئی ہیں، ایک دانا اور باخبر ہستی کی طرف سے، کہ تم نہ بندگی کرو مگر صرف اللہ کی۔ میں اس کی طرف سے تم کو خبردار کرنے والا بھی ہوں اور بشارت دینے والا بھی۔ اور یہ کہ تم اپنے رب سے

معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ ایک مدت تک تم کو اچھا سامان زندگی دے گا اور صاحبِ فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا، لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو میں تمھارے حق میں ایک بڑے ہول ناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ تم سب کو اللہ کی طرف پلٹنا ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔''

قابل غور بات ان آیتوں میں یہ ہے کہ عبادت و استغفار یعنی ''اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو اور اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ'' ان دونوں کا ثمرہ اور صلہ یہ بتایا گیا کہ اللہ ایک مدت تک تمھیں اچھا سامان زندگی دے گا۔ 'متاع حسن' کے جامع لفظ میں وہ تمام فوائد آ گئے ہیں جن کا ذکر سورۂ نوح اور سورۂ ہود کی مذکورہ بالا آیتوں میں ہے۔ قرآن کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مال اسباب، آل و اولاد، کھیتیاں اور باغات، سونا اور روپیہ، جاہ اور منصب اور اس طرح کی تمام متاع دنیا کی دو قسمیں بن جاتی ہیں: متاعِ غرور اور متاعِ حسن۔ یہی چیزیں مالک حقیقی اللہ رب العالمین کے باغیوں اور نافرمانوں کے لیے ''متاعِ غرور'' ہیں اور یہی چیزیں اللہ کے فرماں برداروں اور وفاداروں کے لیے ''متاعِ حسن'' ہیں۔ یہ متاع حسن، دینے والے اللہ کے شکر و سپاس، اس کی عبادت و اطاعت اور جہاد فی سبیل اللہ میں کام آتی ہے اور پھر بطور نتیجہ یہ متاعِ حسن آخرت کی نجات اور خوش نودیِ رب کا ایک ذریعہ بن جاتی ہے۔

آیئے، اب ایک حدیث کا مطالعہ کریں، جسے امام ترمذی، نسائی، احمد، حاکم رحمہم اللہ نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔ یہ حقیر ترمذی شریف سے اس کا ماحصل پیش کرتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت میں ہے کہ ابوطالب بیمار ہوئے تو سردارانِ قریش ان کے پاس پہنچے اور انھوں نے ان سے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شکایت کی۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں پہنچے تو ابوطالب نے کہا:

یا ابن اخی ما ترید من قومك؟ قال: ارید منهم کلمة تدین لهم بها العرب و تؤدی الیهم العجم الجزیة۔ قال: کلمة واحدة؟ قال: کلمة واحدة، فقال یا عمِّ قولُوا، لآ اله اِلا الله۔

(ترمذی، تفسیر سورۂ ص)

> ''اے بھتیجے! تم اپنی قوم سے کیا چاہتے ہو؟ آپ نے فرمایا: میں ان سے صرف ایک کلمہ چاہتا ہوں جس کے ذریعے تمام عرب ان کا فرماں بردار ہو جائے گا اور عجم ان کو جزیہ ادا کرے گا۔ انھوں نے کہا: صرف ایک کلمہ؟ آپ نے فرمایا صرف ایک کلمہ۔ پھر آپ نے فرمایا: اے میرے چچا آپ سب لوگ کہیے لاَ الٰہ اِلاّ اللہ۔''

دیکھیے، اس موقع پر اللہ تعالیٰ کی سکھائی ہوئی حکمت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے مخاطبین کے سامنے ایمان باللہ کا صلہ صرف یہ بیان فرمایا کہ عرب وعجم کی حکومت تمھارے ہاتھوں میں آ جائے گی۔ اگر مخاطبین کے سامنے ایمان و اسلام کے مادی فوائد پیش کرنے کو نعوذ باللہ ذہنی رشوت قرار دیا جائے تو اس سے بڑی ذہنی رشوت اور کیا ہوگی۔

سورۂ ص ہی کی آیت ۵ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے امام بغویؒ کے حوالے سے علاّمہ ثناء اللہ پانی پتی نے لکھا ہے کہ جب حضرت عمرؓ ایمان لائے تو مسلمانوں کو خوشی ہوئی اور کافروں کو غم ہوا تو ولید بن مغیرہ نے سردارانِ قریش سے کہا، جن کی تعداد ۲۵ تھی کہ چلو ابوطالب کے پاس چلیں۔ وہ سب کے سب وہاں پہنچے اور کہا آپ ہمارے بڑے اور بزرگ ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ بے وقوف لوگ (یعنی مسلمان) کیا کر رہے ہیں، ہم آپ کے پاس اس لیے آئے ہیں کہ آپ ہمارے اور اپنے بھتیجے کے درمیان فیصلہ کر دیں۔ ابوطالب نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بلوا بھیجا اور کہا کہ بھتیجے! یہ تمھاری قوم تم سے کچھ چاہتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے پوچھا: آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ تم ہمارے معبودوں کی برائی کرنا چھوڑ دو۔ ہم تم سے اور تمھارے معبود سے صرف نظر کر لیں گے۔ آپؐ نے جواب میں فرمایا:

اتعطونی کلمۃ تملکون بھا العرب و تدین لکم بھا العجم۔

> ''کیا تم میرے سامنے صرف ایک کلمہ کا اقرار کرو گے، اس کے ذریعے تمام عرب کے مالک ہو جاؤ گے اور عجم تمھارا تابع فرمان ہو جائے گا۔''

یہ سن کر ابوجہل نے کہا: تمھارے کیا کہنے ہیں۔ ہم ایک کلمہ کیا، دس کلمے کہنے کو تیار ہیں۔ تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہو لاَ اِلٰہَ اِلَّا اللہ ـــ اس دعوت توحید کو سنتے ہی سب بدک کر بھاگ کھڑے ہوئے اور کہا:

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝ (ص:۵)

''کیا اس نے سارے خداؤں کی جگہ بس ایک ہی خدا بناڈالا، یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔''

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ موقع ومحل کے لحاظ سے مخاطبین کے ذہن اور ان کی نفسیات کے پیش نظر صرف مادی فوائد پیش کرنا نہ صرف جائز بلکہ اس حکمت تبلیغ کے مطابق ہے جن کی تعلیم خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ نیتوں کا حال خدا کو معلوم، لیکن راقم الحروف کے خیال میں کوئی مخلص عالم دین اس کو بے شعوری ہی کی حالت میں 'ذہنی رشوت' کا لقب دے سکتا ہے۔

(ماہ نامہ زندگی رام پور، فروری ۱۹۸۲ء)

# موجودہ زمانے میں دعوت اسلامی کا طریقہ کیا ہو؟

یہ سوال خاصی اہمیت رکھتا ہے کہ موجودہ زمانے میں دعوت اسلامی کا طریقہ کیا ہو؟ ہم دوسروں تک توحید، رسالت، آخرت کے بنیادی عقائد اور بندگی رب واطاعتِ رسول کا بنیادی مطالبہ ہی پیش کریں یا بنیادی عقائد اور بنیادی مطالبہ پر مبنی پوری اسلامی شریعت بھی لوگوں کے سامنے رکھیں؟ دوسرے لفظوں میں یہ سوال یوں بھی کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کی دعوت صرف اجمالی طور پر پیش کی جائے یا اس مکمل نظام زندگی کی تفصیلات بھی پیش کی جائیں؟ حسنِ اتفاق سے اسی موضوع پر ابھی حال میں سید قطب شہیدؒ کا ایک مختصر مقالہ 'کیف ندعو الناس الی الاسلام ؟' (ہم لوگوں کو اسلام کی طرف کس طرح بلائیں؟) پڑھنے کا موقع ملا۔ ان کے مقالات کا ایک مجموعہ دراسات اسلامیۃ کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اسی میں ان کا یہ مقالہ بھی ہے۔ انھوں نے اپنے مقالے کی ابتدا میں لکھا ہے کہ اسلامی شریعت کو اسلامی عقائد سے جدا نہیں کیا جاسکتا، یہ دونوں لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

> ''اسلام انسانی ضمیر کا عقیدہ ہے۔ فرد کے ضمیر میں مخفی عقیدے اور اس شریعت کے درمیان جو اس کی زندگی پر حاکم ہوتی ہے، علیحدگی محال ہے۔ یہ شریعت اسلامی عقیدے پر مبنی ہوتی ہے اور عقیدہ جب دل میں گھر کرلیتا ہے تو وہ کسی شریعت کی صورت میں ظاہر ہونے کے لیے زور لگاتا ہے۔ اسلام کی عین فطرت ہی کے لحاظ سے عقیدہ اور شریعت لازم وملزوم ہیں، ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ حقیقت واضح کردیتی ہے کہ ہم اسلام کی دعوت دینے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کریں۔''

عقیدہ وشریعت کے لازم وملزوم ہونے کی جو صراحت سید قطب نے کی ہے وہ بے حد اہمیت رکھتی ہے، کیوں کہ آج خود مسلمانوں میں اس کے متعلق غلط فہمی اور بعض حلقوں میں گم رہی پھیلی ہوئی ہے۔ بہت سے مسلمانوں نے شریعت کے چند احکام پر عمل کر لینے کو نہ صرف یہ کہ کافی سمجھ رکھا ہے، بلکہ انہی چند احکام کو انھوں نے پوری شریعت کا قائم مقام قرار دے لیا ہے۔ رہا مسلمانوں کا مغرب زدہ حلقہ تو وہ شریعت کو عقیدے سے علیٰحدہ کرنے پر تلا ہوا ہے اور اسلام کو عیسائیت کی سطح پر اتار لانا چاہتا ہے۔ سید قطب نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ جب اسلامی عقیدہ اور اس پر مبنی اسلامی شریعت لازم وملزوم ہیں تو خود یہ حقیقت ہمیں بتاتی ہے کہ دعوت اسلامی کا طریقہ کیا ہونا چاہیے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعوت اسلامی کی ابتدا کی، جب کہ بہت کم لوگ اس کی طرف دھیان دینے والے تھے۔ یہاں تک کہ جب آپ نے اپنی دعوت مکمل کی تو آپ کی حیثیت ایک شارع، ناظم ومنتظم اور حاکم کی تھی۔ آپ نے یہ نہیں کہا کہ ''جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو اللہ کا ہے وہ اللہ کو دو۔'' کیوں کہ اسلام کے نزدیک ہر چیز اللہ کی ہے۔ وہ کسی قیصر کو نہیں جانتا الّا یہ کہ وہ اللہ کی شریعت کو نافذ کرنے والا اور زندگی کو قانون الٰہی کے مطابق منظم کرنے والا ہو۔
>
> ایک طرف یہ تاریخی واقعہ ہے اور دوسری طرف طبیعت اسلام کی وہ حقیقت واضح ہے جس کا ذکر اوپر گزرا۔ یہ دونوں چیزیں واضح کرتی ہیں کہ آج لوگوں کو اسلام کی طرف بلانے کے لیے ہمارا طریقہ کیا ہو۔ اس دین کا آخر اسی چیز سے درست ہو سکتا ہے جس سے اس کا اول درست ہوا تھا، وہ یہ کہ ہم فرد مسلم کی ایسی تربیت وتکوین کریں کہ وہ نظام اسلامی کو بروئے کار لانے کے لیے اپنے ذاتی اور اندرونی جذبے سے بے تاب ہو کر اٹھ کھڑا ہو، لیکن طریق دعوت میں ہمارے اقدامات تھوڑی سی تعدیل کے محتاج ہیں۔ ایسی تعدیل جو اس زمانے کی طبیعت کے مناسب ہو جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان حالات کے مناسب ہو جو زندگی کو گھیرے ہوئے ہیں۔''

یہی وہ نکتہ ہے جس کو واضح کرنے کے لیے انھوں نے مقالہ لکھا ہے۔ موجودہ دَور کی سائنسی ترقیوں کو دیکھ کر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ آج کا ترقی یافتہ انسان اوہام وخرافات سے،

اَن دیکھی طاقتوں سے اور مختلف خداؤں سے نجات پا گیا ہے۔ اس لیے آج کے احوال وظروف اور چودہ سو برس پہلے کے احوال وظروف میں بنیادی فرق واقع ہو گیا ہے۔ سید قطب نے یہ غلط فہمی اپنے مقالے میں دور کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کی ابتدا کی تو سب سے پہلے ضروری تھا کہ انسانی روح کو غیر اللہ کی بندگی وغلامی سے، معاشرے پر چھائے ہوئے اوہام سے اور پست وذلیل خواہشات وشہوات سے آزاد کیا جائے۔ روحِ انسانی کی نجات اور اس کی تطہیر کے لیے، نیز اسے بلند زندگی کی ان ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھالنے کے لیے، جن کا اسلام مطالبہ کرتا ہے، لازمی تھا کہ اسے یہ آزادی نصیب ہو۔

غیر اللہ کی غلامی، خواہ وہ اوہام وخرافات واساطیر کی غلامی ہو یا شہوات اور سفلی جذبات کی غلامی ہو، یہ تمام غلامیاں انسانی طاقت کو ان کاموں میں صرف کرتی ہیں جو انسان کے شایانِ شان نہیں ہوتے اور یہ تمام غلامیاں انسانی طاقت اور حقیقی تعمیر وترقی سے اس کا رخ پھیر دیتی ہیں اور اس کو اچھی زندگی کی ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی سعی سے بھی روک دیتی ہیں، جن کا مطالبہ اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان سے کیا ہے۔

عہد رسالت میں دعوت اسلامی کی سب سے پہلی مہم یہی تھی اور اسی طرح آج بھی دعوت اسلامی کی سب سے پہلی مہم یہی ہونی چاہیے، لیکن صرف زبان سے نہیں، بلکہ عملی نمونے سے بھی۔ جس دعوت کی ترجمان ہماری شخصی زندگیاں نہ ہوں اس کی طرف لوگوں کو دعوت دینے کا ہمیں کیا حق ہے؟ اس دعوت کی کوئی قیمت نہیں جس کی دلیل خود داعیوں کی زندگیوں میں موجود نہ ہو۔ اس حیثیت سے موجودہ زمانے کی حالتوں اور ہیئتوں اور عہد رسالت کی حالتوں اور ہیئتوں کے درمیان ظاہری اختلاف کے سوا کوئی فرق نہیں ہے۔ بعض لوگ یہ خیال کر سکتے ہیں کہ آج کے زمانے میں ارباب متفرقہ یعنی مختلف خداؤں کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی دعوت کا نہ کوئی موقع ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ ان کا یہ خیال ہرگز صحیح نہیں ہے اس لیے کہ اس زمانے کے ارباب متفرقہ کی عبادت زمانۂ جاہلیت کے اربابِ متفرقہ کی عبادت سے کم نہیں ہے۔ تبدیلی جو کچھ ہوئی ہے، جھوٹے خداؤں کے انواع واقسام میں ہوئی ہے۔ ان کی عبادت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے اور جہاں تک شہوات وخرافات کی غلامی کا تعلق ہے وہ بلا استثناء آج بھی باقی ہے۔''

سید قطب کی یہ عبارت پڑھ کر علامہ اقبال کا یہ مصرع یاد آجاتا ہے ؏

''ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے۔''

اگلے زمانے میں لات اور ہبل کے بت بنے ہوئے تھے، اس لیے لوگوں کو وہ بت اور ان کی عبادت آنکھوں سے نظر آتی تھی اور آج قوم و وطن کے بت کھڑے ہوئے نہیں ہیں، اس لیے لوگوں کی آنکھیں نہ ان جھوٹے خداؤں کو دیکھتی ہیں اور نہ ان کی عبادت کو۔

سید قطب نے عہدِ رسالت اور عہدِ حاضر کے احوال و ظروف میں حقیقی یکسانی دکھانے کے بعد طریق دعوت کی وضاحت کی ہے:

> ''آج ہم اپنے اقدامات میں جس تعدیل کے محتاج ہیں وہ یہ ہے کہ ہمیں فرد مسلم کی تربیت و تکوین کے کام کا آغاز صرف اعتقادی اور شخصی برتاؤ کے پہلو سے نہیں کرنا چاہیے، بلکہ ساتھ ہی ساتھ اور بیک وقت زندگی کے اجتماعی پروگرام بھی پیش کرنے چاہئیں۔ یہ پروگرام اسلامی فکر کے اصول پر قائم اور شریعت اسلامیہ سے ماخوذ ہونے چاہئیں۔ اس پروگرام کو پیش کرنے میں ہمیں نہ تو اس کا انتظار کرنا چاہیے کہ امت مسلمہ کے افراد کی تربیت اور تیاری مکمل ہو جائے اور نہ ہمیں اس طرح بتدریج پیش کرنے کی ضرورت ہے جس طرح دعوت اسلامی کے ابتدائی زمانے میں وہ بتدریج پیش کیا گیا تھا۔
>
> یہی وہ واحد تعدیل ہے جس کا تقاضا وہ تغیرات کرتے ہیں جو عصر جدید میں پیدا ہوئے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے جب اپنی دعوت شروع کی تھی تو اس وقت نہ آج کی طرح پائدار اور جمی جمائی حکومت تھی، نہ کوئی نظام تھا اور نہ معین اجتماعی ادارات تھے۔ اسی طرح اس وقت پوری دنیا میں آج کی طرح واضح اور مقرر نظریات نہ تھے۔ جن کے تحت اجتماعیات و اقتصادیات کا انتظام کیا جاتا اور حکومت چلائی جاتی۔ اولاً اسلام ہی کو یہ استطاعت حاصل ہوئی کہ وہ ایک ایک اینٹ رکھ کر اپنا اجتماعی نظام قائم کرے اور جس ہیئت اجتماعی کی تشکیل وہ کرنا چاہتا تھا اس کی نشو و نما کے مطابق معاملات زندگی میں ایک ایک کر کے اپنے نظریات سامنے لائے اور اپنے نظام کی تکمیل کے بعد ان نظامات سے مقابلہ کر کے ـــــ جن سے اس وقت کی دنیا واقف تھی ـــــ انھیں مغلوب کرے اور ان پر غالب آجائے۔ اسلحہ کی قوت سے نہیں، جیسا کہ بعض لوگوں کو

یہی تصور خوش آیند معلوم ہوتا ہے، بلکہ اس قوت فکر یہ سے جو اس میں پائی جاتی تھی۔

اس وقت کی دنیا جن افکار سے واقف تھی ان میں سے کسی کو بھی فکر اسلامی پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ وہ تو دنیا کو بند غلامی سے آزاد کرنے والی ایک چھلانگ تھی، جس کی نظیر سے عالم انسانیت بالکل ناواقف تھا اور آج بھی یہ چھلانگ انسانوں کے تمام اقدامات سے آگے ہے اور ان پر سبقت رکھتی ہے ــــــ ہمارے لیے ضروری ہے کہ عہد جدید کی عقلیت کو مطمئن کرنے کے انداز میں لوگوں کے سامنے یہ حقیقت پیش کریں اور اسے ثابت کریں۔"

جو لوگ سمجھتے ہیں کہ آج دعوت اسلامی کا طریقہ یہ ہے کہ مکی دور کی طرح اسلام کے صرف بنیادی عقائد اور مکارم اخلاق کی کچھ باتیں پیش کی جائیں انھیں یہ عبارت غور سے پڑھنی چاہیے۔ مرحوم مقالہ نگار نے صرف اتنے ہی پر بس نہیں کیا ہے، بلکہ مزید صراحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آج دنیا پر مفصل اجتماعی نظریات کی حکم رانی ہے تو جب ہم لوگوں کو اسلام کی طرف بلائیں تو ہمارے لیے بھی ضروری ہے کہ اسی طرح ہم بھی تفصیل کے ساتھ اسلام کا اجتماعی نظریہ پیش کریں۔"

راقم الحروف نے فروری ۱۹۷۲ء کے شمارے میں یہ لکھا تھا کہ ہم سیاسی و معاشی نظام کے بارے میں کوئی تفصیلی بات یا تو اپنے اصولوں کو سمجھانے کے لیے یا مخاطب کی خواہش اور اس کے مطالبے پر کہتے ہیں، لیکن سید قطب اسلام کے اجتماعی نظریے کو تفصیل کے ساتھ پیش کرنا ضروری قرار دے رہے ہیں اور انھوں نے یہ بات بے دلیل نہیں کہی ہے، بلکہ اس کی دلیلیں بھی پیش کی ہیں۔ ان کی ایک دلیل یہ ہے:

"بے شک صرف نظریۂ زندگی کی اصلاح اور اس کو بلند کرنے کے لیے کافی نہیں ہے، بلکہ ضروری ہے کہ ہم فرد مسلم کی تربیت کریں جو اس نظریے پر ایمان رکھتا ہو، اس کی اچھی طرح نگرانی کرسکے اور عالم واقعہ میں اسے بروئے کار لاسکے۔ لیکن آج فرد مسلم کی تیاری اور تعمیر اس بات کی محتاج ہے کہ اس کے پاس اسلام کے اجتماعی نظریے کے بارے میں مفصل فکر موجود ہو، کیوں کہ موجودہ زندگی کے واقعات و معاملات پر اس

نظریے کو پوری طرح منطبق کیے بغیر دینی وجدان کی تکمیل نہیں ہوسکتی اور نہ اس کے بغیر فہم انسانی کی تکمیل ممکن ہے۔"

ان کی اس دلیل کا تعلق خود داعیوں سے ہے۔ جب تک داعی کے پاس اسلام کے اجتماعی نظریے کی مفصل فکر موجود نہ ہو، وہ آج کی دنیا کے مفصل افکار پر نہ معقول تنقید کرسکتا ہے اور نہ اسلامی فکر کو بصیرت کے ساتھ پیش کرسکتا ہے۔ سید قطب کی یہ دلیل اتنی مکمل اور معقول ہے کہ اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے دوسری دلیل یہ دی ہے:

"جن لوگوں کو ہم اسلام کی طرف بلاتے ہیں وہ زندگی پر دوسرے نظاموں کو حکم راں پا رہے ہیں اور وہ نظام اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ مکمل طور پر اسلامی زندگی بسر کرسکیں، کیوں کہ موجودہ زندگی کے قواعد اسلامی بنیادوں پر قائم نہیں ہیں اور یہیں سے ان کے وجدان دینی اور عملی زندگی کی حقیقت میں تصادم شروع ہوجاتا ہے۔ یہ تصادم فال نیک ہے، کیوں کہ اس کی وجہ سے اس نظام کو بدل دینے کا آغاز ہوتا ہے جو اسلامی زندگی بسر کرنے میں مانع بنا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مانع وحائل نظام، عمل کی اس صورت کے مطابق ہوجائے جو اسلام عطا کرتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ زندگی کی وہ صورت پوری طرح معلوم ہو، تاکہ امت مسلمہ کے افراد ایک واضح راستے پر بصیرت کے ساتھ اسے بروئے کار لانے کی سعی کرسکیں۔

یہی وجہ ہے کہ آج یہ کافی نہیں ہے کہ ہم لوگوں کو مجمل طور پر اسلام یا قرآن یا حکومت الٰہیہ یا شریعت اسلامیہ یا نظام اسلامی یا اسی طرح کی کسی کلی اصطلاح کی طرف دعوت دیں، جس کا ذہنوں میں کوئی تفصیلی مدلول واضح نہ ہو۔"

اس دلیل کا تعلق دعوت اسلامی کے مخاطبین سے ہے اور یہ دلیل بھی کتنی واضح اور معقول ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ غیر اسلامی نظام زندگی کو اسلام کے عطا کردہ نظریہ زندگی کے مطابق کرنا مقصود ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو پھر ناگزیر ہے کہ اسلامی نظام زندگی کو خود بھی تفصیل کے ساتھ سمجھ لیا جائے اور دوسروں کے سامنے بھی تفصیل کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اس کے بغیر مخاطبین میں وہ بے چینی پیدا ہو ہی نہیں سکتی جو کسی غلط نظام کو بدل دینے کے لیے ضروری ہے۔ تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ مجمل دعوت مجرد 'وعظ' بن کر رہ جاتی ہے۔

اسلام کے اجتماعی نظریے کو تفصیل سے جاننے کے لیے سید قطبؒ کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ:

''افراد کی اسلامی تربیت کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے پاس تربیت گاہیں ہوں۔ ان تربیت گاہوں میں انھیں تفصیل سے جاننا چاہیے کہ اسلامی زندگی کی وہ صورت کیا ہے جسے بروئے کار لانے کے لیے انھیں جدوجہد کرنی ہے اور جس کے حصول کے لیے ان کا وجدان دینی انھیں مضطرب کرتا ہے اور اسی طرح اسلامی زندگی کی وہ صورت دوسرے لوگوں کے نزدیک بھی معلوم و معروف ہونی چاہیے، ایسے مفصل اجتماعی نظریات کی شکل میں جو زندگی کے تمام معاملات کو اپنے دائرے میں لیے ہوئے ہو۔''

اس سلسلے میں یہ شبہہ ہوتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ جب تک اسلامی حکومت کی تشکیل کا مرحلہ سامنے نہ ہو اس پر بحث و گفتگو اور اس کی تفصیل غیر ضروری ہے۔ سید قطب نے اپنے مقالے کے اخیر میں یہ شبہہ بھی دور کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ کوئی قبل از وقت قدم نہیں ہے اور یہ سمجھنا کہ اسلامی حکومت قائم ہونے کے وقت کسی تفصیلی خاکے کی ضرورت پیش آئے گی، صحیح نہیں ہے، کیوں کہ اسلامی حکومت قائم ہو نہیں سکتی جب تک تمام لوگ یا لوگوں کی اکثریت اس خاکے سے مطمئن نہ ہو جو اسلام، انسانی زندگی کے لیے دیتا ہے اور جب تک انھیں یہ معلوم نہ ہو کہ اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد ان کی زندگی، تعلقات حقوق، واجبات اور ذمہ داریاں کیا ہوں گی؟ آج کے زمانے میں ہرگز یہ بات کافی نہیں ہے کہ ہم لوگوں کو اختصار و اجمال کے ساتھ اسلام کی طرف بلائیں ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ابتدا میں اختصار و اجمال کے ساتھ اس لیے دعوت دی تھی کہ اس وقت دعوت اسلامی کے مقابلے میں مفصل اجتماعی نظریات موجود ہی نہ تھے۔ اس کے علاوہ جب اسلام کے نظریات ان نظریات سے مقدم ہیں جنھیں آج انسان جانتا ہے تو پھر لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دیتے وقت ہم کیوں نہ ان نظریات کو موجودہ زندگی پر اس کے تمام متعلقات و ضروریات کے ساتھ منطبق کر کے پیش کریں۔''

(ماہ نامہ زندگی رام پور، جون ۱۹۷۲ء)

---

# داعیانِ حق پر اتہامات والزامات

نہ حق و باطل کی کش مکش نئی چیز ہے اور نہ ان دونوں کے مزاج میں فرق آیا ہے۔ شیطان کا غرور آدم کے تواضع و انکسار سے ہزاروں سال پہلے ٹکرایا تھا اور آج تک یہ تصادم جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ تکبرِ عزازیل اسے برداشت نہ کرسکا کہ خلافت الٰہی کا تاجِ کرامت آدمِ خاکی کے سر پر رکھا جائے۔ وہ ناری تھا، بھڑک اٹھا، بھڑک رہا ہے اور بھڑکتا رہے گا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس آگ پر انسانوں کا ایک گروہ ہمیشہ خاک ڈالتا رہا ہے اور قیامت تک اسے بجھانے کی کوشش کرتا رہے گا۔ ایمان وایقان کا نور، کفر وطغیان کے شرارے سے ہمیشہ ستیزہ کار رہا ہے اور رہے گا۔

حق کا مزاج یہ ہے کہ وہ پورے انشراح صدر، کامل یقین، انتہائی صبر وسکون اور نہایت اخلاص وشفقت سے خدا کے بندوں کو خدا کی طرف بلاتا ہے۔ اس کا مقصود اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ خدا کے باغی بندے اس کے وفادار بندے بن جائیں، اپنی ہٹ دھرمی، خود مختاری اور مطلق العنانی سے باز آجائیں اور اس طرح دنیا میں امن وسلامتی کی بہار آجائے، فساد وشر مٹے اور صلاح وخیر فروغ پائے۔ یہی وجہ ہے کہ حق کی دعوت مکر وفریب اور خفیہ ریشہ دوانیوں سے پاک ہوتی ہے۔ جو بات کہی جاتی ہے، ہانکے پکارے کہی جاتی ہے، ڈنکے کی چوٹ کہی جاتی ہے۔ یہاں زیر زمین کچھ نہیں ہوتا، سب کچھ برسر زمین ہوتا ہے۔ یہاں اپنے یا اپنی قوم ونسل ووطن کے اقتدار کی جنگ نہیں لڑی جاتی، بلکہ اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرنے اور کرانے کی مصلحانہ جد وجہد ہوتی ہے۔ جھوٹ کا مقابلہ جھوٹ سے نہیں، بلکہ صدق وراستی سے کیا جاتا ہے اور باطل کا مزاج یہ

ہے کہ وہ انتہائی تذبذب، کامل بے یقینی، بے حد اشتعال اور پورے نفاق ونفرت کے ساتھ خدا کے بندوں کو خدا سے کاٹ کر شیطان سے جوڑنے کی سعی کرتا ہے۔ اس کا مقصود اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ اپنی ہٹ دھرمی، خود مختاری اور مطلق العنانی کو باقی رکھے۔ وہ اپنے یا اپنی قوم ونسل و وطن کے اقتدار کی حفاظت کے لیے ہر وہ تدبیر اختیار کرتا ہے جس سے اس کے دوام و بقا کی امید وابستہ ہو۔ وہ حق کو ختم کرنے کے لیے مکر و فریب، کذب و ریا، خفیہ ریشہ دوانیوں، سازشوں اور منافقانہ تدبیروں کے جال بچھاتا ہے۔ وہ صدق و راستی اور خلوص و دیانت کا مقابلہ کذب و ناراستی اور نفاق و بددیانتی سے کرتا ہے، وہ برسرزمین کچھ کرتا ہے اور زیرزمین کچھ اور۔ وہ جلوتوں میں کچھ کہتا ہے اور خلوتوں میں کچھ اور۔ وہ حق سے خلقِ خدا کے رخ پھیر دینے کے لیے اتہامات تراشتا، بے بنیاد الزامات لگاتا اور طرح طرح کی افترا پردازیاں کرتا ہے۔ جن لوگوں نے آویزشِ حق و باطل کی تاریخ پڑھی ہے اور جنھوں نے حق و باطل کے مزاج کا مطالعہ کیا ہے، مجھے یقین ہے کہ وہ میرے بیان کی تغلیط نہیں کریں گے۔ قرآن کریم آویزشِ حق و باطل کی تاریخ جاننے اور ان دونوں کے مزاج پہچاننے کے لیے دنیا کی سب سے زیادہ سچی کتاب ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے صحابہ نے دعوتِ حق کے سلسلے میں جو کچھ کیا ہے اور ان کے مقابلے میں منکرینِ حق نے جو رویہ اختیار کیا وہ ایسی سچی کسوٹی ہے جس پر پرکھ کر ہم آج بھی حق و باطل کا امتیاز اس طرح کر سکتے ہیں جیسے دن اور رات کا کرتے ہیں۔ راقم الحروف اس مقالے میں اجمالی طور پر یہی لکھنا چاہتا ہے کہ منکرینِ حق نے انبیاء کرام علیہم السلام، ان کی دعوت اور ان کے ماننے والوں پر کیا اتّہامات والزامات لگائے تھے اور انھوں نے مقابلے میں کیا رویہ اختیار کیا تھا۔

اس سے پہلے کہ پھبتیوں، افترا پردازیوں اور اتّہامات والزامات کا ذکر کیا جائے، اس پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہیے کہ منکرینِ حق ایسا کیوں کرتے ہیں۔ وہ دلیل و برہان کا جواب دلیل و برہان سے کیوں نہیں دیتے؟! بات یہ ہے کہ ان کے پاس اپنے معتقدات ونظریات کے لیے کوئی دلیل ہوتی ہی نہیں، ان کے تمام کاروبار کی بنیاد ہوائے نفس، تقلیدِ آباء اور ظن وتخمین پر ہوتی ہے۔ وہ علم سے یک سر محروم اور حقائق سے بالکل عاری ہوتے ہیں۔ وہ سراب کے پیچھے دوڑتے اور کانٹوں کو پھول سمجھتے ہیں۔ ان کی ساری عمارت ریت پر کھڑی ہوتی ہے اور جہاں معمولی سی ضرب لگی

دھڑام سے زمین پر آ رہی۔ وہ پہلے تو اپنے آبا و اجداد کا واسطہ دے کر پاؤں جمانے کی سعی کرتے ہیں، لیکن جب اس میں ناکامی ہوتی ہے تو غصّے سے بھڑک اٹھتے ہیں اور اب حق کو شکست دینے کے لیے وہ سب کچھ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، جس کا ذکر اوپر کیا گیا۔ یہ کائنات باطل کی بنیاد پر نہیں بنائی گئی، بلکہ خالق کائنات نے اسے حق کی بنیاد پر قائم کیا ہے، اس لیے وہی اٹل، پائیدار، اور دائمی ہے۔ باطل تھوڑی دیر کے لیے چاہے کتنے ہی ٹھاٹ جمائے وہ یہاں جم نہیں سکتا، اس کا جماؤ اسی وقت تک ہے جب تک کہ حق زیرِ نقاب ہے۔ جہاں نقاب اٹھی باطل کافور ہوا۔ مثال کے طور پر دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعہ جو دین بھیجا ہے اس کی بنیاد عقیدۂ توحید پر قائم ہے۔ توحید اس کائنات کی وہ حقیقت ہے جس سے زیادہ واضح اور مدلل کوئی دوسری بات نہیں۔ یہاں کا ذرہ ذرہ اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ خدا ایک ہے، کسی دوسرے خدا کا وجود نہیں۔ یہاں شرک کے لیے سرے سے کوئی گنجائش نہیں۔ شرک اس دنیا میں سب سے بڑا ظلم اور سب سے بڑا جھوٹ ہے، اس کے پیچھے کوئی دلیل و برہان نہیں، یہ محض بے بنیاد ہے۔ کوئی داعی حق جب اس حقیقت توحید کا اعلان کرتا ہے تو نہ صرف اس کے جسم کا ایک ایک ریشہ بلکہ آسمان و زمین کا ہر وجود اس کی تصدیق و تائید کر رہا ہوتا ہے۔ اب اس کے مقابلے میں مشرک اپنے شرک کے لیے کون سی دلیل پیش کرے، اس کے پاس نہ کوئی سند ہے نہ دلیل، وہ آباء و اجداد کا واسطہ دے کر اور طرح طرح کی تاویلیں کر کے اسے صحیح ثابت کرنا چاہتا ہے، لیکن ایک بے حقیقت شے تاویلوں سے حقیقت کا لباس نہیں پہن سکتی۔ اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں رہتا کہ داعِ حق کی بات مان لے، یا پھر افترا پردازیوں، مکاریوں اور تہمت تراشیوں سے اس کا مقابلہ کرے۔ جو لوگ اپنے دل کے دروازے بند کر لیتے ہیں وہ یہی دوسری راہ اختیار کرتے ہیں۔ پہلے بھی یہی ہوتا رہا ہے اور آج بھی یہی ہو رہا ہے۔

ایک اور پہلو سے اس مسئلے کو دیکھیے۔ حق کی راہ ایک ہی ہے، صاف اور سیدھی، اس میں کوئی کجی و پیچ نہیں۔ اس راہ پر چلنے والوں کی منزل ایک ہے، مقصد سفر ایک ہے، رہ نما و راہ بر ایک ہے، اس لیے یہاں اختلاف و تناقض کا گزر نہیں۔ یہاں یہ ممکن نہیں کہ زندگی کے کسی مسئلے میں خالق کائنات کی رہ نمائی قبول کی جائے اور کسی دوسرے مسئلے میں خواہش نفس یا کسی دوسرے

جھوٹے خدا کی رہ بری پر اعتماد کیا جائے۔ کسی جگہ رسول کو رسول مانا جائے اور کہیں اس کی دی ہوئی تعلیم سے صرف نظر کر لیا جائے۔ کبھی قیامت کا اقرار کیا جائے اور کبھی انکار۔ اس طرح کا اختلاف اور تناقض حق پرستوں کے گروہ میں نہ پایا جاتا ہے اور نہ پایا جاسکتا ہے۔ لیکن باطل پرستوں کی صفوں پر نگاہ ڈالیے، وہاں قدم قدم پر اختلاف و تناقض نظر آئے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب خالق کائنات کی رہ نمائی چھوڑ دی گئی تو اب وحدت مرکز اور وحدت عقیدہ و عمل ختم ہوگئی۔ اب سیکڑوں خداؤں کی پوجا ہے اور سیکڑوں خداؤں کی اطاعت۔ ؎

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

قرآن کریم نے منکرین حق کے تناقض و اختلاف کو کئی موقعوں پر نمایاں کیا ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

وَ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ○
فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ
مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○ (مریم:۳۶،۳۷)

”بے شک اللہ میرا اور تمھارا رب ہے، لہٰذا اسی کی بندگی کرو، یہی سیدھی راہ ہے۔ پھر الگ الگ راہ اختیار کی فرقوں نے ان میں سے۔ پس خرابی ہے منکروں کی، جب ایک بڑا دن دیکھیں گے۔“

بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْۤ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ○ (ق:۵)

”کوئی بات نہیں، وہ جھٹلاتے ہیں سچے دین کو جب ان تک پہنچا، سو وہ پڑ رہے ہیں الجھی ہوئی بات میں۔“

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ○ اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ○ (الذاریات:۷،۸)

”قسم ہے جال دار آسمان کی، تم پڑ رہے ہو مختلف بات میں۔“

ان آیتوں کا ماحصل یہ ہے کہ توحید و رسالت، نزول قرآن اور بعث بعد الموت کے جو مدلل حقائق ان کے سامنے پیش کیے جارہے ہیں انھیں یہ ہٹ دھرمی سے تسلیم نہیں کرتے اور طرح

طرح کے اختلاف میں مبتلا ہیں۔ یہ اختلاف وتناقض محض اس لیے پیدا ہو رہا ہے کہ وہ ایک ثابت شدہ حقیقت کو ماننے پر آمادہ نہیں۔ ان کے تناقض کا حال یہ ہے کہ ایک بات کا کبھی انکار کرتے ہیں اور کبھی اقرار۔ مثلاً کبھی تو یہ قیامت اور بعد بعث الموت کا اصلاً انکار کرتے ہیں اور کبھی کہتے ہیں کہ ان کے اصنام قیامت کے دن ان کے سفارشی ہوں گے، کبھی تو یہ نبوت اور نزول وحی کا بالکلیہ انکار کرتے ہیں اور کبھی یہ کہتے ہیں کہ صاحب جاہ و مال اس کا مستحق ہے کہ اس پر وحی نازل ہو، مفلس و محتاج کو اس کا استحقاق نہیں: لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ○ (الزخرف: ۳۱) ایک طرف تو وہ اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ نے آسمان و زمین پیدا کیے اور وہی مدبر کائنات ہے اور دوسری طرف اصنام کی عبادت اور ان کے سامنے تمام مراسم عبودیت ادا کرنے پر مصر ہیں۔ اس تناقض کو موٹی عقل کا انسان بھی محسوس کرتا ہے، لیکن عناد اور حب دنیا نے انھیں اندھا بنا دیا ہے۔

یہ اختلاف وتناقض صرف اسی گروہ میں نہیں پایا جاتا جو بنیادی عقائد کا منکر ہے، بلکہ اس گروہ میں بھی پایا جاتا ہے جو زبان سے تمام بنیادی عقائد کو تسلیم کرتا ہے، لیکن عملاً اس کا رویہ وہی ہے جو یک سر منکرین حق کا ہے، جیسے یہود و نصاریٰ کے گروہ۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہ اصل مرکز وحدت سے کٹ گئے ہیں اور اپنی خواہشات نفس کا اتباع شروع کر دیا ہے، اپنی گھڑی ہوئی باتوں کو اصل دین سمجھنے لگے ہیں اور ان پر اصرار کی وجہ سے بیسیوں فرقوں میں بٹ گئے ہیں۔ ان کے تناقض واختلاف کے ذکر سے قرآن کریم بھرا ہوا ہے۔ سورۂ انعام میں فرمایا گیا:

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ؕ
اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ○

(الانعام: ۱۵۹)

”جن لوگوں نے اپنے دین میں تفریق پیدا کی، اس میں راہیں نکالیں اور فرقوں میں بٹ گئے، آپ کا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے۔ وہی ان کو بتائے گا کہ وہ کیا کرتے رہے تھے۔“

ایمان لانے کے بعد بھی یہ تفرق وتشتت اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب ایمان لانے

والوں کے کسی گروہ میں اپنی اہواء وآراء کی پیروی، اپنی جماعت کے علو ورفعت کا غرور اور اپنی گھڑی ہوئی باتوں کو دین میں بنیادی حیثیت دینے کا مرض پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی چیز نے یہود و نصاریٰ کو فرقوں میں بانٹا اور یہی چیز مسلمانوں کو ایک دوسرے سے پھاڑے ہوئے ہے۔ غرض یہ کہ باطل پرستوں کے اہواء وآراء، اغراض ومقاصد، مطمحِ نظر اور مراکزِ عقیدت واطاعت، مختلف اور رنگا رنگ ہوتے ہیں، اس لیے وہ حق کے مقابلے میں کسی ایک موقف پر نہیں جم سکتے۔ حق اور داعیانِ حق کی تردید کے لیے وہ متضاد باتیں اور مختلف اتہامات لگانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کبھی کچھ کہتے ہیں اور کبھی کچھ۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں چوں کہ جھوٹ ہوتا ہے اس لیے دروغ گورا حافظہ نباشد کے بہ مصداق دوسری ایسی بات کہہ گزرتے ہیں جو پہلی کہی ہوئی بات کی ضد ہوتی ہے۔ اب آیئے۔ یہ دیکھیں کہ مختلف منکرینِ حق نے دعوتِ اسلامی اور داعیانِ اسلام کے متعلق کیا کچھ ارشاد فرمایا ہے۔ یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ داعیانِ حق کے بارے میں جو کچھ پہلے کہا گیا اور جو کچھ آج کہا جا رہا ہے وہ محض اس لیے کہ وہ حق کی دعوت کیوں دے رہے ہیں۔ جب بات یہ ہے تو پھر جو اتہامات داعیانِ حق پر لگائے جاتے ہیں وہ دراصل اس حق پر ہوتے ہیں جس کے وہ داعی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام یا ان کے ماننے والوں پر جب منکرینِ حق اتہامات لگاتے تھے یا ان کی تکذیب کرتے تھے تو جواب اللہ تعالیٰ دیا کرتا تھا۔ قرآن کریم میں بار بار اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی کو اس طرح تسلّی دی ہے کہ منکرین کی تکذیب سے تم کیوں دل تنگ ہوتے ہو؟ یہ تمھاری تکذیب نہیں کر رہے ہیں، بلکہ ہمیں جھٹلا رہے ہیں، اس لیے کہ اس دینِ حق کو نازل کرنے والا میں ہوں۔ مشرکین کا گروہ ہو یا یہود و نصاریٰ کا، وہ محمد عربیؐ کا مخالف نہ تھا بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا مخالف تھا۔ وجہِ اختلاف حضورؐ کی نبوّت و رسالت اور دعوتِ دین تھی، نہ کہ ذاتِ گرامی ذاتی حیثیت سے تو مشرکینِ مکہ نے آپ کو وہ لقب عطا کیا تھا جو جزیرۃ العرب کا سب سے محترم اور امتیازی لقب ہو سکتا تھا۔ اللہ کے کلام اور اس کے بھیجے ہوئے پیغام، اس کی دی ہوئی تعلیم اور اس کے اتارے ہوئے دستورِ حیات کا انکار دلیل و برہان سے ممکن نہ تھا، اس لیے معاند منکرینِ حق حواس باختہ ہو کر کبھی اسے شعر کہتے، کبھی کہانت سے تعبیر کرتے، کبھی اس پر اساطیر اولین ہونے

کی پھبتی چست کرتے اور کبھی اس کے سحر مبین ہونے کا اعلان کرتے تھے اور اس سے بھی کام نہ چلتا تو اس پر ضلالت وسفاہت اور افتراء واختلاق کا اتہام لگاتے تھے۔ پھر عناد و مخالفت حق میں خود پاگل ہوجاتے تھے تو اپنے ان تمام اتہامات کے برعکس اسے جنون قرار دیتے تھے۔ ان اتہامات کی قدرے تفصیل یہ ہے:

## (۱) اتّہامِ شعر

شاعری عرب کی گھٹی میں پڑی تھی۔ وہ بڑے زبان آور لوگ تھے، یہاں تک کہ اپنی زبان آوری کے غرور میں عرب سے باہر کے لوگوں کو عجم (گونگا) کہا کرتے تھے۔ شاعری کی قوت کا یہ حال تھا کہ کسی زبان آور شاعر کے چند شعر کسی خاندان یا کسی قبیلے کو آسمان عزت پر پہنچا دیتے یا پھر اسے خاک مذلت پر گرادیتے تھے۔ جنگ کے موقع پر پورے ملک میں آگ لگادیتے اور بارود پر چنگاریوں کا حکم رکھتے تھے۔ بڑی بڑی جنگیں کھڑی ہوجاتی تھیں۔ جب انھوں نے کلام الٰہی کی اثر انگیزی دیکھی تو اپنے خیالِ خام میں یہ سمجھا کہ یہ بھی شاعری ہے، اس لیے اس میں یہ اثر ہے۔ قرآن اس اتہام کی تردید کرتے ہوئے کہتا ہے:

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ (یٰسٓ:۶۹)

''اور ہم نے اسے شعر کی تعلیم نہیں دی اور نہ یہ اس کے لائق ہے۔''

اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ۝ (الطور:۳۰)

''کیا کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہے، ہم منتظر ہیں اس پر گردش زمانہ کے۔''

قرآن کو شعر اور رسول خدا کو شاعر کہنے کو تو انھوں نے کہا، لیکن انھیں فوراً ہی پتہ چل گیا کہ کلام الٰہی شعر نہیں ہوسکتا۔ ان کے ماہرین شعر نے اسے سنا اور فیصلہ کیا کہ اس کلام کو شعر سے لگاؤ نہیں، لیکن پھر بھی انھیں منصب وریاست کی محبت نے ایمان لانے سے باز رکھا۔ عتبہ بن ربیعہ آپ کے پاس گیا، حضورؐ نے اسے قرآن کریم کی چند آیتیں سنائیں اور جب وہ سرداران قریش کے مجمع میں واپس گیا تو صاف اعلان کیا کہ یہ شعر نہیں ہے، کچھ اور ہے، لیکن ایمان لانے کی اسے توفیق نہ ہوئی۔

## (۲) کہانت

عرب میں کہانت کا بھی بہت زور تھا۔ بات یہ ہے کہ وہاں جہالت عام تھی اور جہالت کی وجہ سے توہم پرستی کی حد نہ تھی۔ جب قوم میں توہم پرستی گھر کر جاتی ہے تو وہ بھوت، پریت اور چڑیلوں کے چکّر میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ کاہن عرب میں وہ لوگ ہوتے تھے جن پر شیاطین کی تسلیط ہوتی تھی۔ یہ انتہا درجہ کے ناپاک اور گندے لوگ ہوتے تھے۔ جو کاہن جتنا زیادہ گندہ ہوتا تھا اس پر شیطان کی تسلیط زیادہ ہوتی تھی۔ شیاطین ان کو بعض پوشیدہ باتیں بتا دیتے تھے اور وہ اسے ایک مقفّیٰ و مسجع کلام کے ذریعہ لوگوں کو سنا دیتے تھے۔ اس میں کچھ الفاظ با معنی ہوتے تھے اور زیادہ تر بے معنی اور بھرتی کے ہوتے تھے۔ کہانت کی اس حقیقت کو ان آیتوں میں واضح کیا گیا ہے:

هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ۝ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ۝ (الشعراء:۲۲۱-۲۲۳)

”کیا میں تمھیں بتاؤں، شیطان کس پر اترتے ہیں؟ اترتے ہیں ہر جھوٹے گنہ گار پر، لا ڈالتے ہیں سنی ہوئی بات اور اکثر ان میں جھوٹے ہیں۔“

قرآن کریم میں بھی چونکہ سجع اور فاصلے موجود ہیں اس لیے اتنی ہی مشابہت منکرین کے لیے کافی ہوگئی کہ وہ قرآن کو کہانت اور رسول خدا کو کاہن کہہ دیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ ان کے فہیم لوگ سمجھے نہیں تھے، بلکہ محض اس کلام کو رد کرنے کے لیے انھیں کوئی نہ کوئی اتہام لگانا ضروری تھا۔ قرآن ان کے اتہام کی تردید میں کہتا ہے:

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (الحاقۃ:۴۰-۴۳)

”یہ ایک رسول کریم کا قول ہے، کسی شاعر کا قول نہیں ہے، تم بہت کم یقین کرتے ہو اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے، تم بہت کم دھیان دیتے ہو۔ یہ رب العالمین کا اتارا ہوا ہے۔“

## (۳) اساطیر الاولین

اساطیر، اسطورہ کی جمع ہے۔ عربی زبان میں باطل و بے اصل کہانیوں اور ایسی باتوں کو کہتے ہیں جو از قسم خرافات ہوں۔ جب معاندین کے عناد و مخاصمت کا پارہ کچھ زیادہ چڑھ جاتا تھا تو کلام الٰہی کو اساطیر الاولین کہہ کر رد کرتے تھے۔ منکرین عرب نے بھی قرآن کو اساطیر الاولین کہہ کر رد کیا اور ان سے پہلے اگلی امتوں کے منکرین نے بھی اپنے اپنے عہد کے انبیاء و رسل کی باتوں کو اساطیر الاولین کہہ کر رد کیا۔ انسان جب کسی بات کو نہ ماننے کا ارادہ کر لیتا ہے تو اسے شاعری اور افسانہ قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے: اجی، یہ محض افسانہ ہے، یہ محض شاعری ہے، یعنی اس کی حقیقت نہیں، اس لیے اسے کیوں تسلیم کیا جائے؟ آج بھی خود مسلمانوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو قرآن کو اساطیر الاولین سے زیادہ حیثیت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں، قرآن نے جگہ جگہ کفار و مشرکین اور منکرین حق کے اس قول کو نقل کیا ہے۔

حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ○ (الانعام: ۲۵)

''یہاں تک کہ جب تیرے پاس جھگڑنے کو آتے ہیں تو وہ کافر کہتے ہیں کہ یہ بس پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔''

بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ○ قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ○ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ○ (المومنون: ۸۱-۸۳)

''کوئی بات نہیں، یہ تو وہی کہہ رہے ہیں جیسا کہا کرتے تھے۔ پہلے لوگ کہتے ہیں: کیا جب ہم مر گئے اور ہو گئے مٹی اور ہڈیاں، کیا ہم کو زندہ ہو کر اٹھنا ہے؟ وعدہ دیا جاتا ہے ہم کو اور ہمارے باپ دادوں کو یہی پہلے سے اور کچھ بھی نہیں، یہ نقلیں ہیں پہلوں کی۔''

یعنی محض اس بنیاد پر کہ بعث بعد الموت کی جو خبریں دی جا رہی ہیں ان کا ظہور اب تک نہیں ہوا، کفار قیامت کا انکار کرتے تھے اور اسے اساطیر الاولین قرار دیتے تھے۔

## (۴) افتراء

اساطیر الاولین کے افتراء واختلاق ہونے میں شاید کوئی شبہ رہ گیا تھا، اسی لیے منکرین نے صاف صاف قرآن پر افتراء ہونے کا اتہام لگایا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ رسول جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ اللہ کی نازل کردہ وحی نہیں ہے، بلکہ وہ اپنے جی سے گھڑ کر پیش کر رہے ہیں اور خدا پر جھوٹ باندھ رہے ہیں:

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىهُ ۚ بَلۡ هُوَ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ لِتُنۡذِرَ قَوۡمًا مَّاۤ اَتٰىهُمۡ مِّنۡ نَّذِيۡرٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ لَعَلَّهُمۡ يَهۡتَدُوۡنَ ۝ (السجدۃ:۳)

”یا کہتے ہیں کہ یہ جھوٹ باندھ لایا ہے۔ کوئی بات نہیں، وہ ٹھیک ہے تیرے رب کی طرف سے، تاکہ تو ڈر سنادے ان لوگوں کو جن کے پاس نہیں آیا کوئی ڈرانے والا تجھ سے پہلے، تاکہ وہ راہ پر آئیں۔“

وَاِذَا بَدَّلۡنَاۤ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُفۡتَرٍ ؕ بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۝ (النحل:۱۰۱)

”اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدلتے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے جو اتارتا ہے تو کہتے ہیں کہ تو بنالاتا ہے، یہ بات نہیں، پر اکثر کو ان میں خبر نہیں۔“

اس اتہام کے لیے وہ کئی تعبیریں اختیار کرتے تھے۔ کبھی اسے افترا کہتے، کبھی اختلاق، کبھی افک قدیم اور کبھی سحر مفتری۔ جو لوگ خود دنیا بھر کے مفتری تھے وہ ایسے سچے انسانوں پر افتراء علی اللہ کا اتہام لگاتے تھے جن کی سچائی کے خود معترف تھے۔

## (۵) سحر و ساحری

کلام الٰہی کی انقلاب انگیزی، انبیاء کرام کے بے داغ اخلاق و کردار اور ان کی قوت قدسیہ کی تاثیر کا یہ عالم ہوتا تھا کہ کٹّر سے کٹّر مخالف ایک آن میں اس طرح بدل جاتا تھا کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہو جاتی تھی۔ منکرین حق کی عقل خام میں اس طرح کی حیرت انگیز تبدیلیاں چوں کہ

صرف سحر و ساحری ہی سے ہو سکتی تھیں، اس لیے انھوں نے کلام الٰہی پر سحر مبین ہونے کا اتہام لگایا۔ ان کے نزدیک یہ کھلا جادو تھا کہ سیدنا عمرؓ جیسا سخت مزاج انسان قرآن کے چند بول سن کر کچھ کا کچھ ہو گیا۔ کلام الٰہی پر سحر اور رسولوں پر ساحر ہونے کا اتہام نیا نہیں تھا، قدیم الایام سے منکرین حق یہ اتہام لگاتے آرہے ہیں۔ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے ساحر ہونے کا فرعون اور سرداران فرعون کو اس درجہ یقین تھا کہ اپنے ملک کے بڑے بڑے ساحروں ہی کو ان کے مقابلے کے لیے اکٹھا کیا اور یہ بھی عجیب تماشہ ہے کہ حقیقت ظاہر ہوتے ہی خود ساحر تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت و رسالت پر ایمان لے آئے، لیکن بد بخت فرعون پھر بھی فرعون ہی رہا۔ آن کی آن میں ساحروں کے ذہن و دماغ میں جو انقلاب آیا وہ واقعی حیرت انگیز تھا۔ جو لوگ سحر جیسے شنیع فن کے ماہر اور مکر و فریب کے استاد تھے اور جنھیں فرعون کی طرف سے تقرب کا مژدۂ جان بخش مل چکا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں شکست کا غم و غصہ بھی ان کے دل میں ہوگا، وہ ایک آن میں اس طرح بدل گئے کہ ابھی ابھی دولت دنیا کے لالچی اور صلہ و اجر کے خواہاں اور فرعون کے خوشامدی تھے، لیکن دل کی گرہ کھلتے ہی ایمان و ایقان سے ایسے سرشار ہوئے کہ اپنی جان سے بھی بے پروا ہو گئے اور جن لوگوں نے ابھی ابھی فرعون سے اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ کی درخواست کی تھی، زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہ فرعون ہی سے روٗ در روٗ یہ کہتے ہوئے سنے گئے فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ؈ کاش فرعون سمجھ سکتا کہ انسانوں کے گھڑے ہوئے پر فریب سحر میں، جو صرف نظر بندی کا کام انجام دیتا ہے اور جو محض عارضی اثر پیدا کر دیتا ہے، وہ بات کہاں سے آسکتی ہے جو خدا کے بھیجے ہوئے معجزوں اور اس کی اتاری ہوئی آیات میں ہوتی ہے۔ اللہ کا کلام دلوں کی کایا پلٹ دیتا ہے، سوچنے کے ڈھنگ بدل دیتا ہے، ذہن انسانی کے رخ پھیر دیتا ہے اور دنیا میں اس سے وہ انقلاب آتا ہے جس کا سحر و ساحری میں تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ منکرین حق کے اس اتہام کا قرآن میں بکثرت ذکر کیا گیا ہے:

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ؈ (سبا: ۴۳)

”اور حق جب کافروں کے پاس آیا تو انھوں نے کہا کہ یہ کھلا جادو ہے۔“

وَ اِذَا رَاَوْا اٰیَةً یَّسْتَسْخِرُوْنَ ۝ وَ قَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝

(الصافات: ١٤، ١٥)

”اور جب دیکھیں کچھ نشانی، ہنسی میں ٹال دیتے ہیں اور کہتے ہیں: کچھ نہیں، یہ کھلا جادو ہے۔“

فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ یُّؤْثَرُ ۝ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۝

(المدثر: ٢٤، ٢٥)

”پھر بولا: کچھ نہیں، یہ جادو ہے جو چلا آتا ہے اور کچھ نہیں، یہ انسان کا کہا ہوا ہے۔“

قرآن کریم پر سحر کا اتہام مشوروں اور سازشوں کے بعد لگایا گیا تھا اور لوگوں کو بھڑکانے کے لیے باضابطہ یہ طے کیا گیا تھا کہ اسے سحر ہی کہا جائے۔ اس سازشی مشورے کا ذکر سیرت کی معتبر کتابوں میں موجود ہے:

”اسحاق، حاکم اور بیہقی نے اچھی اسناد سے یہ روایت کی ہے کہ قریش کے چند سردار ولید بن مغیرہ کے پاس آئے۔ ولید ان میں بڑا تجربہ کار اور مسن شخص تھا۔ ولید نے ان سرداروں سے کہا کہ موسم حج قریب آ رہا ہے، اب ہر طرف سے عرب کے وفود یہاں آئیں گے اور تمھارے اس ساتھی (یعنی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خبر پھیل چکی ہے، لہٰذا تمھیں اس شخص کے متعلق کوئی ایک بات طے کر لینی چاہیے، تاکہ وفود عرب سے کوئی ایک ہی بات کہی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی کچھ کہے اور کوئی کچھ۔ اس طرح ایک دوسرے کی تکذیب ہو جائے گی۔ لوگوں نے کہا کہ آپ ہی کوئی بات طے کر دیجیے، تاکہ ہم سب وہی کہیں؟ ولید نے کہا: تم کہتے جاؤ، میں سنتا ہوں۔ لوگوں نے کہا کہ ہم اس کو کاہن کہیں؟ ولید نے کہا: بخدا وہ کاہن نہیں ہے، ہم نے کاہنوں کو دیکھا ہے۔ اس شخص میں نہ تو وہ مہمل گنگناہٹ ہے اور نہ بے معنی قافیہ پیمائی۔ لوگوں نے کہا: تو اچھا ہم اسے مجنون کہیں؟ ولید بولا: بخدا، وہ مجنون بھی نہیں ہے، ہم نے مجنونوں کو دیکھا ہے اور انھیں پہچانتے ہیں، ان کی کوئی بات اس شخص میں نہیں ہے۔ لوگوں نے کہا: تو پھر شاعر کہیں؟ بولا: نہیں، یہ شاعر بھی نہیں، ہم شعر کی تمام اقسام

سے واقف ہیں۔ یہ جو کچھ پیش کرتے ہیں وہ شعر نہیں ہے۔ تب لوگوں نے کہا کہ اچھا اسے ساحر کہیں۔ ولید نے کہا: یہ ساحر بھی نہیں ہے۔ ہم نے بڑے بڑے ساحروں کو دیکھا ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے وہ عجیب شیریں اور بارونق کلام ہے۔ تم اس کے بارے میں جو کچھ کہہ رہے ہو میں جانتا ہوں کہ وہ غلط اور باطل ہے، لیکن بہر حال اگر کوئی بات کہی جاسکتی ہے تو یہی کہ تم اسے ساحر کہو، کیوں کہ یہ وہ کلام ہے جو باپ بیٹوں میں، بھائی بھائی میں اور میاں بیوی میں تفریق پیدا کر رہا ہے۔ یہ سن کر مجلس برخاست ہوگئی اور حج کے موقع پر مکہ والوں نے یہ کیا کہ تمام راستوں پر آدمی متعین کر دیے۔ جو لوگ بھی گزرتے ان کو ڈرا دیا جاتا اور بتا دیا جاتا کہ یہاں ایک ساحر ہے، اس سے خبردار رہنا۔" (شرح زرقانی علی المواہب اللدنیہ)

ایک ایسا اتہام تراشتے ہیں جس سے لوگوں کو دعوت اسلامی سے بھڑکایا جائے۔ ولید بن مغیرہ کو، جسے ریحانۂ قریش کا لقب حاصل تھا، جو فکر کرنی پڑی اس کی ذہنی کیفیت کا نقشہ خود قرآن نے ایسے دل کش انداز میں کھینچا ہے کہ اس سے زیادہ دلکشی ممکن نہ تھی۔ سورۂ مدثر میں ہے:

إِنَّهُ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۝ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝
ثُمَّ نَظَرَ ۝ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۝ ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۝ فَقَالَ إِنْ
هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ ۝ إِنْ هَٰذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۝ (المدثر: ۱۸-۲۵)

"اس نے فکر کیا اور دل میں ٹھہرالیا، سو مارا جائیو، کیا ٹھہرایا، پھر مارا جائیو کیا، کیا ٹھہرایا، پھر پیٹھ پھیری اور غرور کیا، پھر بولا: کچھ نہیں، یہ جادو ہے جو چلا آتا ہے۔ اور کچھ نہیں، یہ کہا ہوا ہے آدمی کا۔"

ولید حقیقت کو سمجھ گیا تھا، لیکن جاہ و منصب کی گدی اور نشۂ استکبار نے اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے باز رکھا۔ یہ جاہ و منصب کی محبت اور اپنی بڑائی کا غرور وہ شئے ہے جس نے نہ جانے کتنوں کو قبول حق سے روکا ہے اور آج بھی روک رہا ہے۔ منکرین حق قرآن کے سحر سے اس درجہ خائف تھے کہ اس کو سننے دینا پسند نہیں کرتے تھے۔ طرح طرح کی تدبیریں اختیار کرتے تھے کہ کسی کان میں یہ صوت سرمدی پڑنے نہ پائے۔ کبھی تو ایسا ہوتا کہ جب آپؐ لوگوں کے یہاں دعوت حق پہنچانے کے لیے تشریف لے جارہے ہوتے تو آپ کے پیچھے ابولہب یا ابوجہل یہ پکارتا

چلتا: لوگو! اس کی بات نہ سننا، یہ تمھارے آباء کا دین بدل دے گا۔ کبھی یہ کرتے کہ جب آپ تلاوت کر رہے ہوتے تو خوب شور وغل مچاتے کہ آپ کی آواز دب جائے اور کسی کے کان میں قرآن کی آواز نہ پہنچ سکے۔ اسی کیفیت کو قرآن نے اس آیت میں بیان کیا ہے:

قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ○ (حٰمٓ السجدہ:۲۶)

''منکرین حق کہتے تھے: اس قرآن کو نہ سنو اور اس کے پڑھنے میں شور مچاؤ، شاید تم غالب ہو۔''

تاریخ جانتی ہے کہ وہ اس میں کام یاب ہوئے یا نہیں اور غلبہ کسے حاصل ہوا۔ اس سلسلے میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی سیرت کا مشہور واقعہ ہے۔ یہ جب قرآن کی تلاوت کرتے تھے تو مردوں اور عورتوں، بوڑھوں اور نوجوانوں کا ہجوم اکٹھا ہو جاتا تھا اور اثر انگیزی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ لوگ ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ قرآن کی آواز کو دبانے والے خود دب گئے اور یہ صدائے جاں نواز جزیرۃ العرب کے ایک ایک گھر میں گونج کر رہی۔ اس واقعہ میں ان لوگوں کے لیے بڑی عبرت ہے جو حق کی آواز کو اسی تدبیر سے دبانا چاہتے ہیں جو مکہ میں اختیار کی گئی تھی۔

## (۶) ضلالت

دل کی آنکھیں جب اندھی ہو جاتی ہیں تو انسان کانٹوں کو پھول، خزف ریزوں کو انمول موتی، تاریکی کو روشنی، غلامی کو آزادی اور حق کو گم راہی سمجھنے لگتا ہے، یا دوسروں کو سمجھانے کی سعی شروع کر دیتا ہے۔ عقل و خرد کی یہ کیسی کم مائیگی ہے کہ انسان اس حق کو، جو اس کے لیے واحد راہ نجات ہے، ضلالت قرار دیتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ انسان جب حیات دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے تو ہر اس شے کو، جو اسے مکدر اور بے آرام کرنے والی ہو، رد کر دیتا ہے، لیکن حق کو حق کہہ کر رد کرنا ممکن نہیں، اس لیے اسے ضلالت قرار دیتا ہے۔ دوسرا سبب یہ ہوتا ہے کہ جب ہر طرف گم راہی پھیلی ہوئی ہو تو حق کو گم راہی قرار دینا آسان ہو جاتا ہے۔ حق اگر غالب ہو تو

اسے گم رہی قرار دینے کی ہمت کم ہی لوگوں کو ہوسکتی ہے۔ سیدنا نوح علیہ السلام نے جب دعوت حق پیش کی تو اس وقت کے سرداروں اور صاحبانِ جاہ و منصب نے انھیں گم راہ کا لقب عطا کیا۔ کیوں کہ حضرت نوح علیہ السلام وہ بات کہہ رہے تھے جو اس سوسائٹی میں نئی تھی اور کوئی اس کا قائل نہ تھا:

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (الاعراف:۶۰)

”بولے سرداراس کی قوم کے، ہم دیکھتے ہیں تجھ کو صریح بہکا ہوا۔“

یہ اتہامِ ضلالت کس بنا پر لگایا گیا تھا؟ محض اس لیے کہ سیدنا نے اپنی قوم سے فرمایا تھا:

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ (الاعراف:۵۹)

”اے میری قوم! اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمھارا کوئی الٰہ نہیں۔ میں تم پر خوف کرتا ہوں ایک بڑے دن کے عذاب سے۔“

اب اگر اللہ رب العالمین کی ہمہ جہتی بندگی اختیار کر لی جائے تو پھر یہ ظلم کی بنیاد پر تعمیر کیا ہوا قصر امارت، یہ عوام کا ناجائز استحصال، یہ خواہش پر قائم شدہ حکومت، یہ عیش و نشاط، یہ خدائی ٹھاٹ کہاں باقی رہیں گے؟ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اسے ضلالت قرار دے کر رد کر دیا جائے۔ اس میں خطرہ کچھ نہیں، کیوں کہ ہر طرف خواہش نفس ہی کی بندگی ہے، بندگیِ رب کا حامی کون ہوگا؟ چناں چہ ہر زمانے میں منکرین حق نے حق صریح کو ضلالت صریح کہہ کر رد کیا ہے اور آج بھی کر رہے ہیں۔

## (۷) سفاہت

سفہ و سفاہت عربی زبان میں رائے کی اس کم زوری کو کہتے ہیں جو نقصان عقل کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ منکرین حق نے ہمیشہ اہل حق کو احمق اور بے وقوف سمجھا ہے اور ان پر نقصانِ عقل و رائے کا اتہام لگایا ہے۔ اس کا سبب بھی وہی ہے جو ضلالت کے بیان میں لکھا گیا۔ باطل پرستوں اور آخرت پر دنیا کو ترجیح دینے والوں کے نزدیک سب سے بڑی حماقت یہ ہے کہ کوئی انسان حق و صداقت کے لیے اپنی دنیا برباد اور اپنا عیش مکدر کرے، آخرت کی امید پر اپنی

خواہشات نفس کی قربانی دے۔ اگر آرام واطمینان کے ساتھ حق کی کچھ پاس داری کر لی جائے تو مضائقہ نہیں، لیکن اس کے لیے اپنی جان پر کھیلنا اور مال لٹانا، جاہ ومنصب سے استعفا دینا اور اپنی بڑائی کو پامال کرنا حماقت ہے، محض حماقت۔ حضرت ہود علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو وہی دعوت دی جو حضرت نوح علیہ السلام نے دی تھی تو قوم کے سرداروں نے انھیں یہ جواب دیا:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّ اِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ○ (الاعراف:۶۶)

''بولے سردار جو کافر تھے اس کی قوم میں: ہم تو دیکھتے ہیں کہ تجھ کو عقل نہیں اور ہم تو تجھ کو جھوٹا گمان کرتے ہیں۔''

یعنی تم باپ دادا کی روش چھوڑ کر خود بھی بے آرام ہوئے اور اب ہمیں بھی مبتلائے مصیبت کرنا چاہتے ہو، اس لیے تم کم عقل ہو اور خواہ مخواہ جھوٹ موٹ خدا کی طرف یہ باتیں منسوب کرتے ہو۔ یہ وہ جواب ہے جو داعیان حق کو ہمیشہ نفس پرست اور معاند منکرین حق نے دیا ہے۔ منافقین مدینہ سے بھی جب مطالبہ کیا گیا کہ بھئی، جب ایمان لائے ہو تو خلوص کے ساتھ لاؤ جواب میں انھوں نے بھی کہا تھا کہ اَنُؤْمِنُ كَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ یعنی کیا ہم بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح دوسرے بے وقوف لوگ لائے ہیں۔ مال غنیمت میں حصہ لینے کے لیے ہمیں سب سے آگے رہنا چاہیے، لیکن یہ کیا کہ راہ حق میں ہم اپنی جانیں بھی دیں اور مال بھی خرچ کریں۔ بھئی، ایسے ایمان سے تو ہمیں باز ہی رکھو، یہ بے وقوفوں کا کام ہے۔

کفار اور منافقین دونوں ہی اس جواب میں ایک دوسرے کے ساتھ ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان نہ ان کے پاس ہے اور نہ ان کے۔ جو لوگ آخرت پر یقین رکھتے ہیں، ان کے نزدیک سب سے بڑی عقل مندی یہ ہے کہ اپنے جسم کا ایک ایک ریشہ اور اپنے مال کی ایک ایک کوڑی راہ حق میں صرف کر دیں، اس لیے کہ یہ وہ تجارت ہے، جس میں گھاٹے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے، صرف خلوص نیت کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے پورے زور کے ساتھ کفار ومنافقین کے اس طعنہ واتہام کو رد کیا ہے:

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرۃ:۱۳)

''خبردار ہو جاؤ، بے شک صرف یہی لوگ کم عقل ہیں، لیکن وہ اس کا علم نہیں رکھتے۔''

یہ بے یقینی، نادانی اور جہل ہی کا کرشمہ ہے کہ آخرت کے دائمی آرام پر دنیا کے عارضی عیش کو ترجیح دی جائے۔ ایسی تجارت میں تو مال لگایا جائے جس میں نفع ونقصان کا یکساں احتمال ہے، لیکن اس تجارت سے روگردانی کی جائے جس میں نقصان کا شائبہ احتمال بھی نہیں۔

## (۸) جنون

منکرین حق جب غصہ واشتعال کی آخری حد پر ہوتے تھے تو انبیاء کرام علیہم السلام کو مجنون کہا کرتے تھے۔ وہ غصے میں خود اتنے پاگل ہو جاتے تھے کہ یہ بھی محسوس نہیں کرتے تھے کہ پہلے جو اتہامات ہم نے لگائے ہیں، جنون کا اس سے کیا لگاؤ ہے۔ بات وہی ہے جو پہلے کہی گئی کہ باطل حق کے مقابلے میں کسی ایک موقف پر ٹک نہیں سکتا، اس لیے حق سے روگردانی کے لیے کبھی کچھ کہتا ہے اور کبھی کچھ۔ جو منہ میں آیا کہہ دیا، اس سے کیا بحث کہ اس میں کوئی معقولیت بھی ہے یا نہیں؟ بڑی بڑی طاقتوں اور حکومتوں کے مقابلے میں تنہا ایک شخص کھڑا ہو کر جب یہ کہتا تھا کہ اگر تم خدا کی طرف نہ پلٹے تو تمھاری طاقتیں اور حکومتیں تہس نہس ہو کر رہیں گی تو با اقتدار لوگ غصے کی جھنجلاہٹ میں اسے مجنون کی بڑ سمجھتے تھے اور داعیِ حق کو مجنون کا خطاب عطا کرتے تھے۔ فرعون کی طاقت کتنی عظیم تھی! اس طاقت کے مقابلے میں جب موسیٰ علیہ السلام کھڑے ہوئے تو فرعون نے غصّے کی جھنجلاہٹ میں اپنے درباریوں کو مخاطب کرتے ہوئے بطور مضحکہ یہ کہا:

اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ۝ (الشعراء:۲۷)

''تمھارا پیغام لانے والا جو تمھاری طرف بھیجا گیا ہے یقیناً دیوانہ ہے۔''

یعنی اس شخص کو دیکھو جس کی قوم میری غلام ہے اور جس کا ایک ایک فرد میری طاقت کے شکنجے میں کسا ہوا ہے، مجھے چیلنج دے رہا ہے، یہ دیوانگی کے سوا اور کیا ہے؟ لیکن یہی جبارِ وقت جب غرق ہونے لگا تو آمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ کی صدا لگانے لگا۔

ٹھیک اسی طرح کفارِ مکہ نے سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝ (الحجر:۶)

''اے وہ جس پر ذکر نازل ہوا ہے! بے شک تو باؤلا ہے۔''

یہاں بھی وہی طاقت کا غرور تھا، لیکن جب فتح مکہ کے دن سردارانِ قریش حضورؐ کے سامنے لائے گئے تو اپنی جاں بخشی کے لیے اخوت و شرافت کا واسطہ دیتے نظر آئے۔

## (۹) اتّہامِ بددینی

مشرکین مکہ اپنے کفر و شرک، شراب خوری و بدکاری، رہزنی و مردم آزاری، نسلی و قبائلی فخر و مباہات اور اپنے اوہام و خرافات ہی کو سچا دین اور صحیح طریقۂ زندگی تصور کرتے تھے اور لطف یہ ہے کہ ان کا سرمایۂ افتخار سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ گرامی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم ملتِ ابراہیمی پر زندگی گزار رہے ہیں۔ عرصۂ دراز کی گم رہی نے ان کے قلب و نظر کو یکسر بدل کر رکھ دیا تھا، یہاں تک کہ اب حالت یہ ہوگئی تھی کہ کوئی شخص اگر ان کے دین کو چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرلیتا تو کہتے کہ وہ صابی یعنی بددین ہوگیا۔ جب سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دینِ حق کا اعلان کیا اور انھیں اس کی طرف بلانا شروع کیا تو انھوں نے حضورؐ کے بارے میں بھی یہی کہا کہ آپ صابی یعنی بددین ہوگئے۔ ان کے اس اتہام کا ذکر بخاری و مسلم اور حدیث کی دوسری کتابوں میں موجود ہے۔ اس اتہام اور تنابز بالالقاب سے بھی ان کی غرض یہی تھی کہ لوگوں کو اس دین سے متنفر کیا جائے اور دینِ آباء پر انھیں جمائے رکھا جائے۔ اس سلسلے میں ابن اسحاق نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دل چسپ واقعہ نقل کیا ہے کہ جب وہ ایمان لائے تو ایک دن صبح کو جمیل بن معمر کے پاس تشریف لے گئے اور جا کر اس سے کہا کہ میں اسلام لے آیا اور دینِ محمدی میں داخل ہوگیا۔ یہ سنتے ہی بغیر کچھ جواب دیے ہوئے جمیل اٹھا اور اپنی چادر کھینچتا ہوا دوڑا۔ حضرت عمرؓ بھی اس کے پیچھے روانہ ہوئے۔ جمیل نے کعبہ کے قریب کھڑے ہوکر بڑے زور سے آواز لگائی: **یا معشر قریش الا ان ابن الخطاب قد صبا۔** ''اے گروہِ قریش! خبردار کہ خطاب کا بیٹا بددین ہوگیا۔''

حضرت عمرؓ نے پیچھے سے آواز دی: یہ جھوٹا ہے، میں بد دین نہیں ہوا، بلکہ میں نے اسلام قبول کیا اور اس بات کی شہادت دی کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے اور محمد اللہ کے رسول اور اس کے بندے ہیں۔ یہ سنتے ہی سرداران قریش اپنی اپنی مجلسوں سے نکل آئے اور مار پیٹ شروع کر دی۔ حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ لوگ مجھے پیٹتے رہے، یہاں تک کہ جب حارث بن ہشام (سردار قریش) نے مجھے پناہ دی تب ہجوم رفع ہوا۔ یہ کچھ مشرکین مکہ کی خصوصیت نہ تھی، بلکہ ہر گم راہ امت نے اپنی گم رہی کو صحیح سمجھا ہے اور جب کسی نبی نے ان کے سامنے دین حق پیش کیا تو انھوں نے ان پر یہی اتہام لگایا کہ تم نیا دین پیش کر رہے ہو اور ہمیں اپنے صحیح دین سے ہٹانا چاہتے ہو۔ فرعون کے سامنے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعلان حق کیا تو فرعونیوں نے آپ پر بھی اتہام لگایا اور اپنی قوم کو اس ذریعہ سے بھڑکایا:

قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ۝ (طٰہٰ: ۶۳)

''(سرداران فرعون) بولے: یہ دونوں جادوگر ہیں، چاہتے ہیں کہ تم کو اپنے جادو کے زور سے تمھارے ملک سے نکال دیں اور تمھارے اچھے طریقہ کو مٹا دیں۔''

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ ۝

(المومن: ۲۶)

''اور فرعون نے کہا: مجھ کو چھوڑو کہ میں مار ڈالوں موسیٰ کو اور بڑا پکارے اپنے رب کو۔ میں ڈرتا ہوں کہ بگاڑے تمھارا دین یا پھیلائے ملک میں خرابی۔''

کفار و مشرکین نے تو ہمیشہ اس طرح کے اتہامات لگائے ہی ہیں، لیکن یہ ان کی خصوصیت نہیں رہی، بلکہ داعیانِ حق پر ان لوگوں نے بھی بد دینی اور گم رہی کے اتہام لگائے جو بنیادی طور پر اسی دین کے ماننے والے ہوتے ہیں جس کی طرف دعوت دی جا رہی ہے۔ ہاں ایسے گروہ کی مخالفت اور اتہام تراشی کی نوعیت میں کچھ فرق ہوتا ہے۔ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

کفار و مشرکین کے سامنے بھی دعوت اسلامی پیش کی اور یہود و نصاریٰ کے سامنے بھی۔ کفّار و مشرکین نے تو صاف اس دعوت کی تکذیب کی اور وہ سارے اتہامات لگائے جن کا مختصر ذکر اوپر گزر چکا، لیکن بنی اسرائیل کے معاندینِ حق کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ یکسر اس دعوت کی تکذیب کر سکیں، اس لیے کہ وہ خود ان بنیادی باتوں پر ایمان و اعتقاد کا دعویٰ کرتے تھے جس کی طرف قرآن انھیں بلا رہا تھا، اس لیے انھوں نے اسے رد کرنے کے لیے اپنی بنائی ہوئی شریعت اور اپنی گھڑی ہوئی فقہ کا سہارا لیا۔ بنی اسرائیل کے احبار و رہبان اپنی قوم کے رب بن چکے تھے اور ان میں کے نفس پرست و معاند حضرات کسی طرح اپنی ربوبیت سے نیچے اترنے کے لیے آمادہ نہ تھے۔ قرآن نے جب ان کی سطحی و ظاہری مذہبیت، ان کے اخلاق و کردار، ان کے تناقض و تضاد اور ان کی بناوٹی شریعت پر، جس کا اصل توریت سے کوئی تعلق نہ تھا، تنقید شروع کی تو وہ تلملا اٹھے اور انھوں نے شریعت محمدی کو گم راہی قرار دیا اور اس میں اس حد تک آگے بڑھے کہ کفّار و مشرکین کو مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ قرار دینے لگے اور ان کی صف میں شامل ہو کر اس دعوت کو مٹا دینے کی سعی کرنے لگے اور اس سعی میں انھوں نے کھلم کھلا منکرینِ حق سے زیادہ کمینہ پن کا مظاہرہ کیا۔ قرآن نے کہا:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۝ (النسآء:۵۱)

''کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا کچھ حصہ ملا ہے کہ وہ جبت و طاغوت پر یقین رکھتے ہیں اور کافروں سے کہتے ہیں کہ یہ لوگ مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں۔''

یہ ہٹ دھرمی، ضد، عناد اور مخاصمت کا وہ درجہ ہے جس کے بعد ہدایت پانے کا کوئی سوال باقی نہیں رہتا۔ اس طرح کی ذلیل اتہام تراشی وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے دلوں پر مہر لگ چکی اور آنکھوں پر پردہ پڑ چکا ہو۔ مسلمانوں کو اس طرح کی تکلیف دہ باتیں سننے کے لیے قرآن نے پہلے ہی تیار کر دیا تھا:

وَ لَتَسۡمَعُنَّ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ وَ مِنَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡۤا اَذًی کَثِیۡرًا ؕ (اٰل عمران:۱۸۶)

"اور بے شک تم سنو گے اگلی کتاب والوں اور مشرکین سے بہتیری اذیت رساں باتیں۔"

تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا تو یہ تلملائے، ان جانوروں کے گوشت کھانے کی حلت اتری جن کو انھوں نے بزعم خود حرام قرار دے لیا تھا، تب یہ بھڑکے، حالت حیض میں عورتوں کے ساتھ کھانے پینے کی اجازت نازل ہوئی تو یہ غصے میں مبہوت ہوئے اور انھوں نے الزام لگایا کہ اس شخص (یعنی حضور فداہ ابی و امی) نے قسم کھالی ہے کہ جس چیز کو ہم حرام سمجھتے ہیں یہ اس کو حلال قرار دے گا اور جس چیز کو ہم حلال سمجھتے ہیں اس کو حرام کہے گا۔ جب کبھی ان کی ظاہری مذہبیت اور ان کی گھڑی ہوئی فقہ پر تنقید کی گئی یہ بدحواس ہوئے اور جو کچھ منہ میں آیا بکنے لگے۔

یہ پہلے ہی لکھا جا چکا ہے کہ مومنین کے گروہ میں بھی جب اپنے اہواء و آراء کو دین میں بنیادی حیثیت دینے کی بیماری داخل ہو جاتی ہے تو یہی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہودیوں کا یہ مرض شریعت محمدیؐ پر ایمان رکھنے والے مسلمانوں میں بھی پیدا ہوا اور انھوں نے بھی فقہی و اجتہادی مسائل کی بنیاد پر مختلف حلقے بنا لیے اور اتنا تشدّد برتا کہ ان حلقوں سے باہر کی ہر آواز کو گم رہی قرار دیا، چاہے اس آواز کی پشت پر کتاب و سنت کی نصوص ہی کیوں نہ ہوں۔ انھوں نے انبیاء کے علاوہ ائمہ و مشائخ کے کچھ افراد کو بھی معصومیت کا درجہ عطا کیا، ان پر تنقید کو ان کی تحقیر اور ان سے اختلاف کو ضلالت شمار کیا، علمائے حق پر خود دوسرے علماء نے محض جزئی، اجتہادی اور تنقیدی امور کی بنیاد پر ضلالت کے جو فتوے لگائے ہیں اگر ان کو جمع کیا جائے تو ایک الگ مقالہ تیار ہو جائے۔ راقم الحروف یہاں صرف ایک فتوے کا مختصر اُذکر کرنا چاہتا ہے، کیوں کہ موجودہ زمانے کے ایک فتوے سے اسے بڑی مناسبت ہے۔ امام اہل سنت احمد بن تیمیہ حرانی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ایک شخص نے علاّمہ ابن حجر مکی علیہ الرحمہ سے ان الفاظ میں سوال کیا:

(۱) ابن تیمیہ نے متاخرین صوفیہ پر اعتراضات کیے ہیں (۲) فقہ اور اصول فقہ میں جو کچھ نئی باتیں لکھی ہیں ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

**اس کا جواب علامہ نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ یہ تھا:**

''ابن تیمیہ نے صرف متاخرین صوفیہ پر ہی اعتراضات نہیں کیے ہیں، بلکہ اس نے فاروق اعظم اور علی مرتضیٰ جیسے صحابہ پر بھی اعتراضات کیے ہیں، اس لیے وہ گم راہ اور بدعتی ہے۔ اس کے کلام کا کوئی وزن نہیں، اسے پھینک دینا چاہیے اور اس کے بارے میں یہ اعتقاد رکھنا چاہیے کہ وہ ایک مبتدع گم راہ اور جاہل شخص تھا۔''

(جلاء العنین فی محاکمۃ الاحمدین)

ابن حجر مکیؒ نے ابن تیمیہؒ کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اور جو الفاظ استعمال کیے ہیں ان میں سے کچھ کا ترجمہ میں نے پیش کیا ہے۔ ان کے تمام شنیع الفاظ کے ترجمہ کی ہمت نہیں۔ ابھی حال کے ایک فتوے کے بعد جب میں نے اسے پڑھا تو دونوں کی یکسانی پر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ تاریخ اپنے آپ کو کس طرح دہراتی رہتی ہے؟! میرے دل میں عرصہ سے یہ خلجان تھا کہ جو لوگ سلف صالحین اور مشائخ کرام کے ادب و احترام کا وعظ کہتے نہیں تھکتے اور محض ان پر تنقید کی وجہ سے دوسروں کو گم راہ قرار دیتے ہیں، خود ان کے اپنے اعمال سلف صالحین کے کارنامہ ہائے زندگی کے خلاف کیوں ہیں؟ ان کو تو سب سے زیادہ سلف صالحین کا متبع ہونا چاہیے تھا۔ شکر ہے کہ یہ خلجان امام عبدالوہاب شعرانی کی ایک تحریر سے دور ہوگیا۔ انھوں نے اپنی کتاب الانوار القدسیۃ فی بیان آداب العبودیۃ میں ایک جگہ اپنے وقت کے کچھ ایسے مشائخ کی نفسیات کا نقشہ کھینچا ہے جو اس بات کے عادی تھے کہ لوگ ان کا ادب واحترام کریں، ان کے ہاتھ چومیں، ان کے سامنے نگاہیں نیچی کرکے بیٹھیں، ان کے پاس بہ کثرت آئیں جائیں اور سیدی فلاں اور حضرت الشیخ فلاں کی آوازیں گونجتی رہیں، اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ شعرانی کی عبارت کا ترجمہ یہ ہے:

''اور نفس اس طریقے پر تعظیم کا عادی ہوجاتا ہے، لوگ اس کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم سیدی الشیخ فلاں کے پاس جارہے ہیں تو نفس کی سرکشی وتکبر بڑھ جاتا ہے اور جب لوگ اس کے پاس آنا اور ہاتھ چومنا چھوڑ دیتے ہیں، مقابل سے آنکھیں ملاکر باتیں کرنے لگتے ہیں، اس کی خدمت میں کوتاہی کرتے اور اس کی طرف توجہ میں کمی کردیتے ہیں تو نفس اس سے وحشت محسوس کرتا ہے، پھر وہ صاحب نفس کو سمجھاتا ہے کہ اے شخص! لوگوں کو ادب مشائخ کی حکایتیں سنا، تاکہ اس طرح اللہ تیری مصیبت

دور کرے اور لوگ ان حکایتوں کو سن کر تیرا ادب کرنے لگیں۔ نفس کے اس مشورے کے بعد وہ اپنے شاگردوں پر تو یہ ظاہر کرتا ہے کہ اسے مخلوق کی توجہ وعدم توجہ کی کوئی پروا نہیں ہے، لیکن اس کے دل کا یہ حال ہوتا ہے کہ اس غم میں پھٹا جارہا ہے۔ وہ لوگوں کو صراحتہً اپنی تعظیم کا حکم اس خوف سے نہیں دیتا کہ کہیں لوگ اس مطالبہ کی وجہ سے اسے حقیر ومعیوب نہ سمجھنے لگیں، اس چیز سے بچنے کے لیے وہ لوگوں کو ادب مشائخ کی حکایتیں سناتا ہے، حالاں کہ اس سے اس کا مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس کا ادب کریں حتیٰ کہ اگر وہی لوگ اس کے اقران وامثال کا ادب نہ کریں تو وہ ان کے اس طرزِ عمل سے بسا اوقات دل میں خوش ہوتا ہے، کیوں کہ اس طرح مخلوق کے درمیان تنہا اس کی عظمت کا سکہ جم جاتا ہے۔'' (ص: ۲۳)

دیکھا آپ نے، سلف صالحین اور مشائخ کے ادب واحترام کی غلغلہ اندازی کا مقصد یہ بھی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ کی قبر ٹھنڈی کرے۔ انھوں نے نفس کے ایک بڑے کید ومکر کا راز فاش کیا ہے۔

## (۱۰) طلبِ ملک ودولت کا الزام

یہ بات بھی ایک مسلسل تاریخ ہے کہ جب کبھی دین حق کی دعوت دی گئی اور اللہ کے بھیجے ہوئے نظامِ حیات کی تنفیذ واقامت کی جدوجہد شروع کی گئی تو بااقتدار طبقے کی طرف سے داعیان حق پر طلبِ ملک ودولت کا الزام لگا دیا گیا۔ لوگوں کو یہ کہہ کر بھی بھڑکانے کی کوشش کی گئی کہ یہ لوگ اصلاح نہیں چاہتے، بلکہ ملک میں اپنی بڑائی کا سکّہ جمانا چاہتے ہیں۔ اب ایک اور طبقہ بھی اس الزام دہی میں پہلے طبقے کا شریک ہوگیا ہے۔ یہ ان لوگوں کا طبقہ ہے جو اپنے آپ کو بہت ہی زیادہ دنیا سے کنارہ کش اور دنیا طلبی کے شائبے سے بھی پاک سمجھتا ہے۔ یہ طبقہ جب کسی گروہ کو دیکھتا ہے کہ وہ دنیا کے نظامِ معیشت ومعاشرت کو بدل کر اس کی بنیاد اللہ کے اتارے ہوئے نظام پر قائم کرنے کی سعی کر رہا ہے اور انھیں بھی دعوت دے رہا ہے کہ اپنے گوشوں سے نکل کر یہ کام کریں تو بڑی معصومیت سے کہتا ہے کہ یہ لوگ محض حکومت کے طالب ہیں، دنیا طلبی کر رہے ہیں، ہمیں اس سے کیا غرض۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جواب میں فرعونیوں نے یہ الزام بھی لگایا تھا:

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ (یونس:۷۸)

"بولے کیا تو آیا ہے کہ ہم کو پھیر دے اس رستہ سے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے اور تم دونوں کو سرداری مل جائے اس ملک میں، اور ہم تم کو ماننے والے نہیں ہیں۔"

کیسے لطف کی بات ہے کہ جو لوگ انسان کی جھوٹی اور بے اصل کبریائی مٹا دینے کے لیے کھڑے ہوئے تھے، انھی پر طلب کبریائی کا الزام لگایا گیا۔ جب خود انبیاء پر یہ الزام لگایا گیا تو ان کے ماننے والوں کا کہاں ٹھکانا۔ چناں چہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت پر جب کچھ ایسے لوگوں نے لبیک کہی جو جاہ و منصب اور مال و دولت نہ رکھتے تھے تو سرداران قوم نوح نے ان کی دعوت کو اس بنا پر رد کیا کہ آپ کا اتباع ہماری قوم کے اراذل نے کیا ہے، اس سے ان کا مقصود یہ تھا کہ نادار اور کم درجہ کے لوگوں نے آپ کی دعوت اس لیے قبول نہیں کی ہے کہ دلائل سے انھوں نے اس کو حق سمجھا ہے، بلکہ محض اپنے کو نمایاں کرنے اور مال و دولت کی طلب میں انھوں نے اس نئی تحریک کو قبول کیا ہے۔ مال دار و با اقتدار طبقہ کی نفسیات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ نادار و محتاج لوگوں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو زیادہ عقل مند و فہیم بھی سمجھتے ہیں اور یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتے کہ محتاج لوگ ان کی عقل و فہم کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کا مستحق صرف اپنے آپ کو سمجھتے ہیں اور دوسرے کم درجہ کے لوگوں میں اگر کوئی اچھی بات دیکھ پاتے ہیں تو اس کی اچھائی سے انکار کر دیتے ہیں۔ جب اس دنیا کے آخری نبی سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعوت اسلامی پیش کی اور اس راہ میں طرح طرح کے مصائب جھیلنے لگے تو سرداران قریش نے بھی یہی سمجھا کہ ہو نہ ہو، آپ ملک و دولت کے خواہاں ہیں، ورنہ یہ مصیبتیں نہ جھیلتے۔ چناں چہ انھوں نے عتبہ کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا اور اس نے آپ کے سامنے نہ صرف مال و دولت بلکہ مکہ کی حکومت بھی پیش کی، لیکن اس کے جواب میں جب اس نے قرآن کی آیتیں سنیں تو حیرت زدہ اور مایوس واپس گیا۔ وہ مکالمہ جو رسول خداؐ اور عتبہ میں ہوا تھا وہ سیرت کا ایک بڑا ہی اثر انگیز واقعہ ہے۔

سرداران قوم نوح کی طرح سرداران قریش نے بھی بے منصب و مال مسلمانوں کی تحقیر کی تھی۔ ابتداء میں بہتیرے ایسے لوگوں نے بھی ایمان قبول کیا تھا جو غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے، اس لیے قریش کی اونچی ناک والوں نے حضورؐ سے مطالبہ کیا تھا کہ ان غلاموں اور کم رتبہ لوگوں کو ہٹایئے تو ہم آپ کی مجلس میں بیٹھ سکتے ہیں اور یہی غرور تھا جس نے ان کے منہ سے اَھٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا کا تمسخر نکلوایا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ غرور واستکبار چاہے جاہ و منصب، مال و دولت اور اقتدار کا ہو یا علم و مشیخت کا، قبول حق میں ہمیشہ مانع رہا ہے اور آج بھی ہے۔

داعیان حق پر نہ صرف طلب دنیا کا الزام لگایا جاتا ہے، بلکہ یہ الزام بھی چپکایا جاتا ہے کہ یہ لوگ ملک میں فساد مچاتے، تخریبی سرگرمیاں انجام دیتے اور لوگوں کے اتحاد کو پاش پاش کر کے تفریق پیدا کرتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان تمام اتہامات و الزامات کے مقابلے میں داعیان حق کا رویہ کیا ہوتا ہے؟

## داعیانِ حق کا رویہ

ایک صورت تو یہ تھی کہ ان اتہامات و الزامات کے مقابلے میں مخالفین پر اتہامات و الزامات لگائے جاتے اور جھوٹ کا جواب جھوٹ سے ترکی بہ ترکی دیا جاتا، لیکن اس کے بعد انھیں داعیان حق کا منصب بلند نہ مل سکتا، ان میں اور دشمنان حق میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اس لیے داعیان حق نے مقابلے میں صبر و تحمل، معقولیت اور تفہیم و نصیحت کا رویہ اختیار کیا ہے۔ وہ ایسی بات نہیں کرتے جس سے مخالفین میں اور اشتعال پیدا ہو۔ اس طرح اس دعوت کو سخت نقصان پہنچتا، کیوں کہ اشتعال انگیزی سے مخاطب کے دل کا دروازہ اس دعوت کے لیے بند ہو جاتا ہے جو اسے دی جارہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو مصائب و شدائد کے وقت صبر و تحمل اور اشتعال انگیزیوں اور بے ہودگیوں کے وقت عفو و درگزر اور اعراض و عدم تعرض کی تعلیم دی ہے۔ اتہامات کے سلسلے میں قرآن مجید کے جو حوالے دیے گئے ہیں وہاں اتہامات کے جواب بھی موجود ہیں۔ طوالت کے خوف سے ہم نے ان کا ذکر نہیں کیا ہے اور اجمالاً ایک ہی جگہ داعیان حق کے رویے کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں اس سلسلے کی چند آیتیں درج کی جاتی ہیں:

وَ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَ تَتَّقُوۡا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ۝

(آل عمران:۱۸۶)

''اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ ہمت کے کام ہیں۔''

یہ اس آیت کا تکملہ ہے جس میں کہا گیا تھا کہ جان و مال میں تمھاری آزمائش کی جائے گی اور اہل کتاب و مشرکین سے تم بہت تکلیف دہ باتیں سنو گے۔ ایسے مواقع کے لیے علاج بتایا گیا۔ صبر و تقویٰ:

وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمۡ رَبُّكَ اَعۡمَالَهُمۡ ؕ اِنَّهٗ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ ۝ فَاسۡتَقِمۡ كَمَاۤ اُمِرۡتَ وَ مَنۡ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطۡغَوۡا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ۝ (ہود:۱۱۱، ۱۱۲)

''اور جتنے لوگ ہیں جب وقت آئے گا تیرا رب ان کے اعمال کا پورا بدلہ دے گا۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ اس سے باخبر ہے، پس تو استقامت اختیار کر جیسا تجھ کو حکم ہوا اور جس نے توبہ کی تیرے ساتھ۔ بے شک وہ دیکھتا ہے جو تم کرتے ہو۔''

فَاصۡبِرۡ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الۡعَزۡمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسۡتَعۡجِلۡ لَّهُمۡ ؕ (الاحقاف:۳۵)

''پس تو صبر کر جس طرح صبر کرتے رہے ہیں ہمت والے رسول اور ان کے معاملے میں جلدی نہ کر۔''

وَمَا خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَيۡنَهُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَقِّ ؕ وَ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصۡفَحِ الصَّفۡحَ الۡجَمِيۡلَ ۝ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الۡخَلّٰقُ الۡعَلِيۡمُ ۝ وَلَقَدۡ اٰتَيۡنٰكَ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِىۡ وَالۡقُرۡاٰنَ الۡعَظِيۡمَ ۝ لَا تَمُدَّنَّ عَيۡنَيۡكَ اِلٰى مَا مَتَّعۡنَا بِهٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡهُمۡ وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَيۡهِمۡ وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝ وَقُلۡ اِنِّىۡۤ اَنَا النَّذِيۡرُ الۡمُبِيۡنُ ۝ كَمَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَى الۡمُقۡتَسِمِيۡنَ ۝ الَّذِيۡنَ

جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ۝ فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ۝ (الحجر:۸۵-۹۵)

”اور ہم نے آسمان وزمین اور ان کی موجودات کو حق کی بنیاد پر بنایا ہے اور یقیناً قیامت آنے والی ہے۔ پس آپ شریفانہ درگزر سے کام لیجیے، بے شک آپ کا رب پیدا کرنے اور علم رکھنے والا ہے۔ آپ کو جو حکم ہوا اسے کھول کر سنا دیجیے، اور مشرکوں سے اعراض کیجیے، ان کی پروانہ کیجیے، ہم آپ کی طرف سے تمسخر کرنے والوں کے لیے کافی ہیں۔“

یہ صرف چند آیتیں ہیں۔ ان سے متعین ہو جاتا ہے کہ مشکلات وموانع اور مخالفین کے کمینہ پن اور ان کی بے ہودگیوں کے مقابلے میں داعیانِ حق کا کیا رویہ ہونا چاہیے؟ اب آپ تاریخ کے صفحات کھول کر دیکھ لیجیے کہ داعیانِ حق نے ان احکام کے ایک ایک حرف پر عمل کر کے دکھا دیا ہے یا نہیں؟

مقصودِ کلام یہ ہے کہ جو لوگ بھی دعوتِ حق اور اقامتِ دین کا فریضہ انجام دینا چاہتے ہیں، ان کے لیے لازمی ہے کہ وہی رویہ اختیار کریں جو انبیاء کرام نے اختیار کیا تھا۔ ان کے لیے کسی طرح جائز نہیں کہ اس کے خلاف اقدام کریں۔

(ماہ نامہ زندگی رام پور، اپریل مئی ۱۹۵۴ء)

# دعوتِ حق کی مخالفت

مخالفت کی دو قسمیں ہیں۔ کسی کی مخالفت کبھی عدم علم اور غلط فہمی کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ یہ پہلی قسم ہے۔ کبھی کسی کی مخالفت حسد اور احساس برتری کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ یہ دوسری قسم ہے۔ پہلی قسم کی مخالفت حقیقت بتادینے یا غلط فہمی دور کردینے کے بعد ختم ہوجاتی ہے، بلکہ بسا اوقات مخالفت کرنے والے لوگ اس شخص یا اس بات کے حامی ہوجاتے ہیں جس کی وہ مخالفت کررہے تھے۔ دوسری قسم کی مخالفت چوں کہ عدم علم یا کسی غلط فہمی کی وجہ سے نہیں ہوتی، بلکہ حسد اور گھمنڈ کی وجہ سے ہوتی ہے، اس لیے حقیقت واضح ہوجانے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتی، بلکہ بسا اوقات اس میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

سورۂ البقرہ کی ابتدا میں حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت کا قصہ بیان کرکے مخالفت کی ان دونوں قسموں کا نمونہ سامنے رکھ دیا گیا ہے۔ فرشتوں نے خلافت آدم کی مخالفت عدم علم کی وجہ سے کی۔ ان کی نظر صرف اس پہلو پر تھی کہ انسان دنیا کے ساز و سامان اور ان میں تصرف کا اختیار پاکر زمین میں فساد مچائے گا اور خوں ریزی کرے گا۔ انھیں نہ آدم کے علم کا پتہ تھا اور نہ اس خیر کا علم تھا جو خلافت آدم سے زمین پر رونما ہونے والی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان پر حقیقت واضح ہوگئی تو نہ صرف یہ کہ وہ خلافت آدم کے حامی ہوگئے، بلکہ پورے انشراح کے ساتھ آدم کے آگے جھک گئے ــــ شیطان کو اس سے کوئی بحث نہ تھی کہ انسان دنیا میں فساد مچائے گا یا خیر و صلاح کو پروان چڑھائے گا۔ اس کے دل میں صرف اپنی برتری کا احساس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جس حقیقت نے فرشتوں کو مطمئن کردیا وہ شیطان کو مطمئن نہ کرسکی اور اللہ تعالیٰ کے صریح حکم کے باوجود آدمؑ کے

آگے جھکنے سے انکار کر دیا اور اس انکار کی وجہ یہ بتائی کہ:

قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِىْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝

(الاعراف:۱۲)

''اس نے کہا میں اس سے افضل ہوں مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے بنایا ہے۔''

لہٰذا آگ مٹی کے آگے کیسے جھکے گی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ:

تکبر عزازیل را خوار کرد  بزندان لعنت گرفتار کرد

گھمنڈ نے ابلیس کو ذلیل کر دیا اور اس کو خدائی پھٹکار کے قید خانے میں دھکیل دیا۔

یہ تمہید تھی اس بات کی کہ آگے قرآن کریم اور نبوت محمدیؐ سے یہودیوں کے انکار کی جو تفصیل آ رہی ہے اس کی وجہ پوری طرح واضح ہوجائے اور یہ بات بھی واضح ہوجائے کہ یہودیوں میں سے جو لوگ ایمان لائے اس کی وجہ کیا تھی؟ ایمان نہ لانے والوں کا نمونہ شیطان کی مخالفت میں اور ایمان لانے والوں کی مخالفت کا نمونہ فرشتوں کی مخالفت میں موجود ہے۔

یہودی علماء کو اپنے علم، اپنے نمائشی تقویٰ، اپنے مدارس، مال و دولت اور ذرائع و وسائل پر بھی گھمنڈ تھا۔ ان کے علم و تقویٰ کی دھاک صرف یہودی عوام ہی پر نہیں، عرب کے مشرکوں پر بھی بیٹھی ہوئی تھی اور جہاں تک اوس و خزرج کے قبیلوں کا تعلق ہے، وہ ان کے علمی و اقتصادی ریاست کے شکنجے میں کسے ہوئے تھے۔ وہ قرآن کی دعوت اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوت و رسالت کو اپنی ریاست کے لیے ایک چیلنج سمجھتے تھے۔ انھوں نے قرآن کی دعوت کو کچلنے کے لیے ایک طرف اپنے مال و دولت اور تمام ذرائع و وسائل کو داؤں پر لگا دیا اور دوسری طرف سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف طرح طرح کی بہتان تراشی کے لیے ایک پوری فیکٹری کھول دی، جہاں سے پورے عرب میں ڈھلے ڈھلائے اور ترشے ترشائے الزامات سپلائی ہونے لگے۔ انھوں نے صرف یہودی عوام کو اسلام سے روکنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ مشرکین عرب کو بھی راہ حق سے روکنے کے لیے مکہ اور اطراف مکہ میں وفود بھیج کر انھیں مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے اور مسلمانوں کو کچلنے کے لیے اپنی ہر طرح کی مدد کا یقین دلانے لگے ــــ حسد کے مالیخولیا میں

انھیں یہ بالکل نہ سوجھا کہ خود ان کی اپنی صفوں کا حال کیا ہے؟ وہ خودنمائشی تقویٰ کے لبادے میں جس دنیا پرستی میں گرفتار ہیں اور انھوں نے اپنے معتقدین کو جس سطحی دین داری کے سانچے میں ڈھالا ہے اس نے ان کی قوم کو اندر سے کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔

ان کے شور وشغب، لاف وگزاف، چلت پھرت اور ان کے قلعے شاید مسلمانوں کو ذہنی طور پر کچھ پریشان کرتے، اس لیے قرآن نے ان کے کھوکھلے پن کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ سورۂ حشر میں یہ نقشہ کھینچا گیا ہے:

لَا یُقَاتِلُوْنَکُمْ جَمِیْعًا اِلَّا فِیْ قُرًی مُّحَصَّنَۃٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ بَاْسُھُمْ بَیْنَھُمْ شَدِیْدٌ ؕ تَحْسَبُھُمْ جَمِیْعًا وَّ قُلُوْبُھُمْ شَتّٰی ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْقِلُوْنَ ۚ (الحشر: ۱۴)

’’یہ کبھی اکٹھے ہو کر (کھلے میدان میں) تمھارا مقابلہ نہ کریں گے، لڑیں گے بھی تو قلعہ بند بستیوں میں بیٹھ کر یا دیواروں کے پیچھے چھپ کر یہ آپس کی مخالفت میں بڑے سخت ہیں۔ تم انھیں اکٹھا سمجھتے ہو، مگر ان کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں۔ ان کا یہ حال اس لیے ہے کہ یہ بے عقل لوگ ہیں۔‘‘

یہ تھے وہ لوگ جو مسلمانوں کی ’سیسہ پلائی ہوئی دیوار‘ کو ڈھانے چلے تھے اور مشرکین کو یہ خوش خبری سناتے پھرتے تھے کہ ہماری طاقت تمھاری پشت پر ہے، ہر طرف سے سمٹ کر آؤ اور مسلمانوں کو کچل کر رکھ دو۔ لیکن جب مسلمانوں سے خود ان کے مقابلے کا وقت آیا تو وہ اپنے گھروں میں گھسے رہے اور ان کی ساری شیخی کرکری ہو کر رہ گئی۔

یہودی علماء، یہودی رؤساء اور یہودی عوام، قیامت تک کے لیے نمونۂ عبرت بنا دیے گئے ہیں۔ ان کی تاریخ پڑھ کر ہر شخص یہ جان سکتا ہے کہ علمائے سوء، روسائے عیش پرست اور جہلائے عوام کے عقائد و اعمال کیا ہوتے ہیں؟ اور ان کے اٹھائے ہوئے طوفان مخالفت سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کن صفات کی ضرورت ہے؟ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے آیت بالا (الحشر: ۱۴) کے حاشیے میں لکھا ہے:

''یعنی مسلمانوں کے مقابلے میں ان کے ظاہری اتفاق و اتحاد سے دھوکا مت کھاؤ۔ ان کے دل اندر سے پھٹے ہوئے ہیں۔ ہر ایک اپنی غرض وخواہش کا بندہ اور خیالات میں ایک دوسرے سے جدا ہے۔ پھر حقیقی یک جہتی کہاں میسر آسکتی ہے؟ اتحاد اسے کہتے ہیں جو مومنین قانتین میں پایا جاتا ہے کہ تمام اغراض وخواہشات سے یکسو ہو کر سب نے ایک اللہ کی رسی کو تھام رکھا ہے اور ان سب کا مرنا جینا اسی خدائے واحد کے لیے ہے۔''

اس عبارت میں مسلمانوں کے اتحاد کے لیے جو کچھ لکھا گیا ہے اسے ہم 'سیسہ پلائی ہوئی دیوار' سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ جب تک تمام ذاتی اغراض وخواہشات سے یک سو ہو کر ایک اللہ کی رسی کو مضبوطی سے نہ تھاما جائے اور جب تک اللہ ہی کے لیے مرنا جینا نہ ہو، کسی مسلم گروہ پر 'بنیان مرصوص' کا لفظ صادق نہیں آتا اور جب تک کوئی مسلم گروہ 'بنیان مرصوص' نہ بن جائے وہ دشمنوں کی سرد و گرم مخالفتوں سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ دنیا بھر کے حقیقی داعیان حق کے لیے یہودیوں کی تاریخ کو اپنے سامنے رکھنا اور اس سے سبق لیتے رہنا ضروری ہے۔

دعوت اسلامی اور نبوت محمدیؐ سے مشرکین مکہ کی مخالفت بھی انہی دو قسموں میں محصور تھی جن کا اوپر ذکر گزرا، لیکن فرق یہ تھا کہ یہودیوں کی اکثریت دوسری قسم کی مخالفت میں سرگرم تھی، اس لیے وہ ایمان نہ لائی۔ ان میں ایک قلیل تعداد ایسی تھی جو توریت پر واقعی ایمان رکھتی اور اس کی ہدایات پر عمل پیرا تھی۔ وہی قلیل تعداد نبوت محمدیؐ اور قرآن پر بھی ایمان لائی۔ مشرکین کی اکثریت پہلی قسم کی مخالفت میں سرگرم تھی اور جب اس نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ قرآن اللہ کا کلام اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں تو وہ ایمان لے آئی۔ ان کی قلیل تعداد، جس کا سرغنہ ابوجہل تھا، دوسری قسم کی مخالفت میں گرفتار تھی، اس لیے وہ ایمان نہ لائی اور اپنے کیفر کردار کو پہنچ گئی۔

یہ بات مسلّم ہے کہ مثال کے طور پر ابوجہل یہ سمجھ گیا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو دعوت پیش کر رہے ہیں وہ حق ہے اور وہ اللہ کے رسول ہیں، لیکن جب جاہ ومنصب اور حسد نے اس کو اندھا بنا دیا۔ وہ زبان سے انکار کرتا اور آخری دم تک اپنی برتری کے احساس میں گرفتار رہا۔ آخر کار غزوۂ بدر میں لڑتا ہوا مارا گیا۔

ابولہب انتہائی گھٹیا قسم کی زر پرستی میں مبتلا تھا، اس لیے اس کی مخالفت اور دعوت اسلامی

سے اس کا عناد پستی کی آخری سطح تک پہنچ گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انتہائی ذلت کی موت مرا۔ وہ بیمار پڑا تو چھوت کے ڈر سے اس کے رشتہ داروں نے اس کو بے یار و مددگار تنہا چھوڑ دیا۔ تنہائی میں وہ مرا اور اس کی لاش سڑ گئی۔ آخر مجبور ہو کر اس کی اولاد نے چند حبشیوں کو اجرت دے کر اس کی لاش اٹھوائی اور ان حبشیوں نے اس کو مٹی کے نیچے دبا دیا۔ اس کی اور اس کی شریر النفس بیوی کی مذمت اور ان دونوں کے برے انجام کے بیان میں قرآن کریم کی ایک پوری سورت نازل ہوئی۔ اس طرح دنیا میں بھی قیامت تک اس پر لعنت برستی رہے گی۔

ابوجہل اس امت کا فرعون تھا۔ ابولہب کو اس امت کا قارون کہنا چاہیے۔ مال کی کثرت کے لحاظ سے نہیں، بلکہ جنون زر پرستی کے لحاظ سے۔ ان دونوں میں مشابہت یہ ہے کہ قارون بنی اسرائیل کا ایک فرد تھا، اس کے باوجود محض جنونِ زر پرستی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کی اور ان پر ایمان نہ لایا۔ ابولہب بنی ہاشم کا ایک فرد تھا اور اس نے بھی جنون زر پرستی میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کی اور ایمان نہ لایا۔ وہ دناءت اور پستی کی جس سطح پر پہنچ گیا تھا اس کی تفصیل یہاں مقصود نہیں۔ یہاں جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس کا مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ انبیاءِ کرام علیہم السلام نے جو دعوت حق پیش کی اس کی مخالفت کن محرکات کے تحت کی گئی تھی؟ ابولہب کے انتہائی گھٹیا کردار کی تفصیل جاننے کے لیے مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہما اللہ کی تفسیر سورۂ لہب پڑھنی چاہیے۔

ان مثالوں کو سامنے رکھا جائے تو قیامت تک داعیان حق کو اپنی مخالفت پر کوئی حیرت نہ ہوگی اور نہ وہ اس کی وجہ سے مایوس اور دل تنگ ہوں گے، بلکہ پورے خلوص کے ساتھ راہِ حق پر جمے رہیں گے۔

(ماہ نامہ زندگی رام پور، اگست ۱۹۸۰ء)

# مخالفتوں کے ہجوم میں انبیائے کرام کا اسوہ

اعلائے کلمۃ اللہ اور دعوت الی الحق کی راہ پھولوں کی سیج کبھی نہیں رہی، یہ ہمیشہ کانٹوں سے بھری رہی ہے۔ اس راہ کے مسافروں کے مبارک قدم صرف کانٹوں ہی سے چھلنی نہیں ہوئے ہیں، بلکہ بسا اوقات انھیں تلواروں کی دھار پر بھی چلنا پڑا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کی رضا یا اس کی رضامندیوں اور خوش نودیوں کا مظہر ــــ جنت ــــ بڑی گراں قیمت نعمت ہے۔ یہ وہ نعمت ہے جو مکارہ سے ڈھکی ہوئی ہے۔ اس پر ایذا رساں کانٹوں کی تہ در تہ چادریں پڑی ہوئی ہیں اور جب تک انگلیوں کو زخمی اور پورے جسم کو لہولہان کر کے، ایک ایک چادر اٹھا کر پھینک نہ دی جائے۔ یہ باغِ نعمت نہ جنت نظر بن سکتا ہے اور نہ فردوس گوش ہوسکتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی یہ کانٹے برچھیوں کی اَنی، تیروں کے پھل اور تلواروں کی دھار بن جاتے ہیں اور اس دولتِ لازوال کے طلب گاروں کو خاک وخون پر لٹا دیتے ہیں، ان کے دل وجگر کو برما دیتے اور ان کے حلقوم کو تراش کر رکھ دیتے ہیں۔ اعلائے کلمۃ اللہ اور دعوت الی الحق کی جدو جہد کا مقصود دراصل اسی نعمت کا حصول ہے۔

تمسخر، مضحکے، پھبتیاں، سحر یے، قہقہے، دھمکیاں، یہ وہ تحفے ہیں جو منکرینِ حق نے ہمیشہ داعیانِ حق کے سامنے پیش کیے ہیں۔ حق و باطل کی کش مکش کا کوئی دَور نہ اس سے خالی رہا ہے، نہ رہ سکتا ہے۔ اللہ کے مقدس رسولوں کو مجنون (پاگل) کہنا تو دنیا پرستوں کی طرف سے ایک ایسا لقب ہے جو ان سب کا طرۂ امتیاز بن گیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام وہ پہلے داعیِ حق ہیں جن کی دعوت اور کارِ دعوت کی تفصیل ہمیں ملتی ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ ان کی منکرِ حق قوم اس وقت بھی

ان کی ہنسی اڑانے سے باز نہ آئی، جب خدا کا عذاب، تیغِ بے نیام کی طرح اس کے سروں پر لٹک رہا تھا:

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأٌ مِّنْ قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ قَالَ إِنْ تَسْخَرُوا مِنَّا فَإِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُونَ ۝

(ہود:۳۸)

''نوح کشتی بنا رہے تھے اور ان کی قوم کے سردار جب بھی ان کے پاس سے گزرتے تو ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ انھوں نے کہا اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم بھی تم پر ہنس رہے ہیں۔''

اللہ کے رسول جرمِ بغاوت کی پاداش میں جس عذاب کا ڈراوا سناتے ہیں، وہ مجرموں کی آنکھوں سے مخفی ہوتا ہے اور ان کے دل کی آنکھیں اندھی ہوتی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ عذابِ الٰہی کی وعید کو غلط سمجھتے اور مضحکہ انگیز انداز میں خود اس کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں:

قَالُوا يٰنُوحُ قَدْ جَادَلْتَنَا فَأَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (ہود:۳۲)

''آخر کار ان لوگوں نے کہا: اے نوح! تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت کر لیا۔ اب تو بس وہ عذاب لے آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو، اگر سچے ہو۔''

تمسخر کے ساتھ ساتھ ان کی دھمکیاں بھی جاری رہتی ہیں:

قَالُوا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ۝

(الشعراء:۱۱۶)

''وہ بولے: اے نوح! اگر تو (کارِ دعوت سے) باز نہ آیا تو ضرور سنگسار کر دیا جائے گا۔''

حضرت ہود علیہ السلام سے ان کی قوم کے سرداروں نے کہا:

إِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (الاعراف:۶۶)

''ہم تو تمھیں بے وقوف سمجھتے ہیں اور ہمیں گمان ہے کہ تم جھوٹے ہو۔''

انھوں نے عذاب الٰہی کا مطالبہ ان الفاظ میں کیا:

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَ نَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○ (الاعراف:۷۰)

''کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم اکیلے خدا کی عبادت کریں اور انھیں چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں۔ اچھا تو لے آ وہ عذاب جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے اگر تو سچا ہے۔''

حضرت لوط علیہ السلام کو ان کی قوم نے جو جواب دیا تھا وہ یہ تھا:

اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ○

(الاعراف:۸۲)

''نکالو ان لوگوں کو اپنی بستی سے، یہ بڑے پاک باز بنتے ہیں۔''

حضرت شعیب علیہ السلام کو دھمکی دی گئی:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۭ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ○ۚ (الاعراف:۸۸)

''اس کی قوم کے سرداروں نے جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا تھے، اس سے کہا: اے شعیب! ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں، اپنی بستی سے نکال دیں گے، ورنہ تم لوگوں کو ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا۔''

تقریباً یہی دھمکی جن سنگھ اور ہندو مہا سبھا ہندستان کے مسلمانوں کو دے رہی ہے —

قوم فرعون نے اپنے بادشاہ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی طرف سے جن الفاظ میں چوکنا کیا تھا وہ یہ تھے:

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ۭ (الاعراف:۱۲۷)

''فرعون سے اس کی قوم کے سرداروں نے کہا: کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو یوں ہی چھوڑ دے گا کہ ملک میں فساد پھیلائیں اور وہ تیری اور تیرے معبودوں کی بندگی چھوڑ بیٹھے؟''

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلے کے بعد فرعون کے ساحر ایمان لے آئے تو اس نے غرّا کر کہا:

فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيۡدِيَكُمۡ وَاَرۡجُلَكُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمۡ فِیۡ جُذُوۡعِ النَّخۡلِ (طٰہٰ:۷۱)

''اب یقیناً میں تمھارے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کٹوادوں گا اور تمھیں کھجور کے تنے پر سولی دے دوں گا۔''

فرعون نے بنی اسرائیل کا تعاقب کرنے کے لیے اپنی قوم کو جن الفاظ میں ابھارا وہ یہ تھے:

اِنَّ هٰٓؤُلَاۤءِ لَشِرۡذِمَةٌ قَلِيۡلُوۡنَ ۝ وَاِنَّهُمۡ لَنَا لَغَآئِظُوۡنَ ۝

(الشعراء:۵۴،۵۵)

''یہ لوگ ایک چھوٹی سی جماعت ہیں اور بلاشبہہ ان کے دل ہماری طرف سے غصے میں بھرے ہوئے ہیں اور ہم سب کے سب ان کی طرف سے خطرے میں مبتلا ہیں۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے باپ نے یہ دھمکی دی:

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنۡتَ عَنۡ اٰلِهَتِىۡ يٰۤاِبۡرٰهِيۡمُ ۚ لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَهِ لَاَرۡجُمَنَّكَ وَاهۡجُرۡنِىۡ مَلِيًّا ۝ (مریم:۴۶)

''اے ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے روگرداں ہوگیا ہے؟ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے سنگ سار کردوں گا۔ جا، ایک لمبے عرصے کے لیے تو میرے پاس سے دور ہو جا۔''

ان کی قوم نے محض لفظی دھمکی پر اکتفا نہ کی، بلکہ عملاً انھیں آگ کے الاؤ میں پھینک دیا۔

قَالُوۡا حَرِّقُوۡهُ وَانۡصُرُوۡۤا اٰلِهَتَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ فٰعِلِيۡنَ ۝ قُلۡنَا يٰنَارُ كُوۡنِىۡ بَرۡدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبۡرٰهِيۡمَ ۝ (الانبیاء:۶۸،۶۹)

''اس کی قوم کے لوگوں نے کہا: اگر تم کچھ کرنا چاہتے ہو تو اسے جلا دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔ ہم نے کہا: اے آگ! تو ابراہیم کے لیے ٹھنڈک اور سلامتی ہو جا۔''

بعض مقامات پر منکرینِ حق کی روش کا ایک عمومی ذکر ان الفاظ میں آیا ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ اَجۡرَمُوۡا كَانُوۡا مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یَضۡحَكُوۡنَ ۝ وَ اِذَا مَرُّوۡا بِهِمۡ یَتَغَامَزُوۡنَ ۝ وَ اِذَا انۡقَلَبُوۡۤا اِلٰۤى اَهۡلِهِمُ انۡقَلَبُوۡا فَكِهِیۡنَ ۝ وَ اِذَا رَاَوۡهُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَضَآلُّوۡنَ ۝

(المطففین: ۲۹-۳۲)

''مجرم مومنوں پر ہنسا کرتے تھے اور جب ان کے پاس سے گزرتے تو ایک دوسرے کو آنکھ مارتے اور جب اپنے گھر واپس جاتے تو بات بناتے جاتے اور جب مسلمانوں کو دیکھتے تو کہتے کہ یہ لوگ بہک گئے ہیں۔''

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ان کی قوم نے جو کچھ کیا اس پر ابھی چودہ سو برس کا زمانہ گزرا ہے اور اس کا ہر جزو ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ یہاں نہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا استقصاء مقصود ہے اور نہ ان تمام مصائب و آلام کی تفصیل مطلوب ہے جو ان کی قوموں نے انھیں پہنچائے، بلکہ صرف اس کی تذکیر مدنظر ہے کہ دعوت الی الحق جن مراحل سے گزرتی ہے یہ ان کا ایک ناگزیر مرحلہ ہے۔

یہ بھی دیکھ لینا چاہیے کہ وہ کیا باتیں تھیں، وہ کیا جدوجہد تھی، وہ کیا حرکت عمل تھی اور وہ کیا جرم تھا جس کی پاداش میں داعیانِ حق کے ساتھ یہ سب کچھ کیا جاتا رہا اور کیا جارہا ہے؟

حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ کی طرف سے اپنی قوم کو جو دعوت دی تھی وہ یہ تھی:

اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَ اتَّقُوۡهُ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ۝ (نوح: ۳)

''اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔''

انھوں نے ساڑھے نو سو برس تک جس عظیم اور جاں کاہ جدوجہد میں زندگی بسر کی اس کا نقشہ یہ تھا:

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا ۙ فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْۤ
اِلَّا فِرَارًا ۝ وَاِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْۤا اَصَابِعَهُمْ
فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝ۚ
ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝ۙ ثُمَّ اِنِّیْۤ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ
لَهُمْ اِسْرَارًا ۝ۙ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ۙ
یُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ۙ وَّیُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ
بَنِیْنَ وَیَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّیَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝ؕ مَا لَكُمْ لَا
تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۝ۚ وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ۝ (نوح:۵-۱۴)

''نوح نے کہا: اے میرے پروردگار! میں اپنی قوم کو رات اور دن (حق کی طرف) بلاتا رہا، لیکن وہ لوگ میری پکار سے دور ہی بھاگتے رہے۔ اور میں نے جب کبھی انھیں دعوت دی، تاکہ تو انھیں بخش دے تو وہ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے لگے، اپنے آپ کو کپڑوں سے ڈھانکنے لگے، اپنی روش پر اصرار اور سخت گھمنڈ کا مظاہرہ کرنے لگے۔ پھر میں نے مجمع میں انھیں برملا پکارا۔ پھر میں نے انھیں علانیہ اور خفیہ دعوت پہنچائی۔ میں نے کہا: اپنے رب سے مغفرت طلب کرو، وہ بڑا بخشنے والا ہے، وہ تمھارے لیے موسلا دھار پانی برسائے گا، تمھارے اموال و اولاد میں اضافہ کرے گا اور تمھیں گھنے باغ اور نہریں عطا کرے گا۔ تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ اللہ کی عظمت وجلال کا یقین نہیں کرتے، جس نے تمھیں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ سے گزار کر دنیا میں پیدا کیا۔''

حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو وہی دعوت دی جو حضرت نوح علیہ السلام نے دی تھی اور ساتھ ہی ساتھ انھوں نے جن برائیوں پر اپنی قوم کو ٹوکا اور جن خرابیوں سے انھیں روکا ان میں کی چند یہ تھیں:

وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ

مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۪ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ۝

(الاعراف:۸۵،۸۶)

”اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا: اے برادران قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔ تمھارے پاس تمھارے رب کی صاف رہ نمائی آ گئی ہے، لہٰذا وزن اور پیمانے پورے کرو، لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو اور زمین میں فساد برپا نہ کرو، جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے، اس میں تمھاری بھلائی ہے اگر تم واقعی مومن ہو۔ اور ہر راستے پر رہ زن بن کر نہ بیٹھ جاؤ کہ لوگوں کو خوف زدہ کرنے اور ایمان لانے والوں کو خدا کے راستے سے روکنے لگو اور سیدھی راہ کو ٹیڑھا کرنے کے درپے ہو جاؤ۔“

یہ آیت بہت سی دوسری آیتوں کی طرح یہ بات واضح کرتی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا مقصد صرف اتنا نہ تھا کہ وہ اپنی قوم کو توحید کی دعوت دیں اور ایمان لانے والوں کو اللہ کے انعام کی بشارت اور منکرین حق کو اس کے عذاب کی وعید سنائیں، بلکہ وہ معاشرے کی کامل اصلاح اور سماج میں ہمہ گیر انقلاب برپا کرنے کے لیے بھیجے جاتے تھے۔ انسان کے پاس صرف دو چیزیں ہیں: روح و بدن اور مال و متاع۔ وہ جس طرح انسان کی روح و بدن کو صرف خدا کی چوکھٹ پر جھکا دینا چاہتے تھے، ٹھیک اسی طرح اس کے کاروبار اور نظام اقتصادیات و مالیات کو بھی صرف قانون الٰہی کا پابند بنا دینا چاہتے تھے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں بہ انداز طنز و تضحیک ان کی قوم نے جو بات کہی تھی وہ یہ تھی:

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ۝

(ہود:۸۷)

''اے شعیب! کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟ یا یہ کہ ہم کو اپنے مال میں اپنے منشا کے مطابق تصرف کرنے کا اختیار نہ ہو؟ بس تو ہی تو ایک عالی ظرف اور راست باز آدمی رہ گیا ہے۔''

اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کے مخاطبین نے ان کی دعوت کے دونوں اجزاء کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا ـــــ حضرت لوط علیہ السلام نے جس بدکاری سے اپنی قوم کو روکا وہ یہ تھی:

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ۝ (الاعراف:۸۰،۸۱)

''اور لوط کو ہم نے پیغمبر بنا کر بھیجا۔ پھر یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم ایسے بے حیا ہو گئے ہو کہ وہ فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا؟ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے اپنی خواہش پوری کرتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم بالکل ہی حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس اس مقصد سے بھیجے گئے تھے کہ وہ اپنے دل و دماغ اور اعضاء و جوارح کو برے عقائد و خیالات اور برے اعمال و افعال سے پاک اور خشیتِ الٰہی سے اپنی زندگی معمور کرے۔ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا:

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ؗ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۝ۙ وَ اَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۝ؕ (النازعات:۱۶-۱۹)

''فرعون کے پاس جا، وہ سرکش ہو گیا ہے۔ اس سے کہہ: کیا تو سنورنا چاہتا ہے؟ میں تجھے تیرے رب کی طرف رہ نمائی کروں تو تیرے دل میں خدا کا خوف پیدا ہو۔''

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قوم آپ کے اعلیٰ اخلاق و کردار کی معترف تھی اور اس بات کا بھی اعتراف کرتی تھی کہ آپ اچھے اخلاق کا حکم دیتے اور برے اخلاق سے روکتے ہیں۔ آپ ایک ایسی دعوت پیش کر رہے تھے جو اس کی فلاح دارین کی ضامن تھی۔

یہ ہے وہ جد و جہد اور یہ ہے وہ جرم جس کے بدلے میں داعیانِ حق کی قومیں اپنے بہی خواہوں کی دشمن بن جاتی تھیں اور آج بھی بن جاتی ہیں۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا اس کے بعد یہ بات جاننے کی خواہش آپ سے آپ پیدا ہوتی ہے کہ ایسے تکلیف دہ ماحول اور ایسے سخت حالات میں داعیانِ حق کی روش کیا رہی؟ کیا حالات سے گھبرا کر انھوں نے دعوت میں کچھ سستی دکھائی؟ کیا وہ دھمکیوں سے ڈر کر اپنے موقف سے کچھ پیچھے ہٹ گئے؟ داعیانِ حق کی تاریخ کا یہ بھی ایک بڑا اہم اور وسیع باب ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی ایک تقریر ملاحظہ کیجیے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ ۘ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَقَامِي وَتَذْكِيرِي بِآيَاتِ اللَّهِ فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوا أَمْرَكُمْ وَشُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوا إِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُونِ ۝ (یونس:۷۱)

''ان کو نوح کا قصہ سناؤ، اس وقت کا قصہ جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اے برادرانِ قوم! اگر میرا تمھارے درمیان رہنا اور اللہ کی آیات سنا سنا کر تمھیں غفلت سے بیدار کرنا تمھارے لیے ناقابل برداشت ہو گیا ہے تو میرا بھروسہ اللہ پر ہے، تم اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو ساتھ لے کر ایک متفقہ فیصلہ کر لو اور جو منصوبہ تمھارے پیش نظر ہو اس کو خوب سوچ لو، تاکہ اس کا کوئی پہلو تمھاری نگاہ سے پوشیدہ نہ رہے، پھر میرے خلاف اس کو عمل میں لے آؤ اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو۔''

خدا کی طاقت و حفاظت پر کتنا جاندار توکل، اپنے موقف کی حقانیت کا کیسا زندہ یقین

اور دعوت حق کی راہ میں سر دھڑ کی بازی لگا دینے کا کس قدر بے پناہ جذبہ ہے اس جوابی تقریر میں؟!
ایک موقع پر حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی طاقت ور اور سرکش قوم کو یہ جواب دیا تھا:

إِن نَّقُولُ إِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوءٍ ۗ قَالَ إِنِّي أُشْهِدُ اللَّهَ وَاشْهَدُوا أَنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ ○ مِن دُونِهِ ۖ فَكِيدُونِي جَمِيعًا ثُمَّ لَا تُنظِرُونِ ○ إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ رَبِّي وَرَبِّكُم ۚ مَّا مِن دَابَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا ۚ إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ○

(ہود: ۵۴-۵۶)

''میں اللہ کی شہادت پیش کرتا ہوں اور تم گواہ رہو کہ یہ جو اللہ کے سوا دوسروں کو تم نے خدائی میں شریک ٹھیرا رکھا ہے میں اس سے بیزار ہوں۔ تم سب کے سب مل کر میرے خلاف اپنی کرنی میں کسر نہ اٹھا رکھو اور مجھے ذرا مہلت نہ دو۔ میرا بھروسہ اللہ پر ہے، جو میرا بھی رب ہے اور تمھارا رب بھی۔ کوئی جان دار ایسا نہیں جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو۔''

انبیاء کرام کے درمیان سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ منکرین حق کی دھمکیوں کا جواب براہ راست خود خدائے قادر و توانا نے دیا ہے:

وَإِن كَادُوا لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا ۖ وَإِذًا لَّا يَلْبَثُونَ خِلَافَكَ إِلَّا قَلِيلًا ○ (بنی اسرائیل: ۷۶)

''اور یہ لوگ اس بات پر تُلے ہوئے ہیں کہ تمھارے قدم اس زمین سے اکھاڑ دیں اور تمھیں یہاں سے نکال باہر کریں، لیکن اگر یہ ایسا کریں گے تو تمھارے بعد یہ خود یہاں کچھ زیادہ دیر نہ ٹھیر سکیں گے۔''

مدینہ میں مکہ کے واقعہ کو ان الفاظ میں یاد دلایا ہے:

وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۚ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ○

(انفال: ۳۰)

''وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب کہ منکرین حق تیرے خلاف تدبیریں سوچ رہے تھے کہ تجھے قید کردیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کردیں۔ وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی چال چل رہا تھا اور اللہ کی چال سب سے بڑھ کر ہوتی ہے۔''

انبیاء کرام کی شان تو بہت اونچی ہے، ان کے ماننے والوں نے بھی منکرینِ حق کے چیلنج اور ان کے لاؤلشکر کے مقابلے میں صبر وثبات اور استقامت کا ثبوت دیا ہے:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ○ (آل عمران:۱۴۶)

''اس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے دل شکستہ نہیں ہوئے، انھوں نے کم زوری نہیں دکھائی، وہ (باطل کے آگے) سرنگوں نہیں ہوئے، ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔''

حضور نبی کریم (فداہ ابی وامی) کے صحابہ نے غزوۂ احد میں سیکڑوں زخم کھانے کے بعد تخویف اور دہشت انگیزی کے موقع پر جو کچھ کہا وہ یہ ہے:

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ڰ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ○

(آل عمران:۱۷۳)

''اور وہ جن سے لوگوں نے کہا کہ تمھارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں ان سے ڈرو تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہتوں کا کارساز ہے۔''

غزوۂ احزاب میں جب کہ عربی قبائل کی متحدہ طاقت نے مدینہ کی چھوٹی سی بستی کو گھیر لیا تھا۔ صحابہ نے کیا کہا؟

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ
رَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۝

(الاحزاب:۲۲)

”اور جب مسلمانوں نے دشمن کی فوجوں کو دیکھا تو کہا: یہ تو وہ چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ و رسول سچے ہیں اور اس بات نے ان کے ایمان اور اطاعت میں اضافہ کر دیا۔“

داعیانِ حق کی یہ روشن تاریخ کیسی روح پرور، کتنی ایمان افروز اور کس قدر تسلی بخش ہے؟! اس کے ہوتے ہوئے کیا کسی بھی داعیِ حق گروہ کے لیے مایوسی، بزدلی اور دہشت زدگی کی ذرہ برابر کوئی گنجائش موجود ہے؟

(ماہ نامہ زندگی رام پور، اگست ۱۹۶۲ء)

# اسلامی معاشرہ کی تعمیر و تشکیل کے بنیادی اصول

رمضان المبارک کی ایک شب قدر میں غار حرا کے اندر جب وحی الٰہی کا پہلا نور چمکا اور جبریل امین اللہ کے آخری نبی و رسول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ کا حکم لے کر آئے، اس وقت سے لے کر تیرہ برسوں تک محمد عربی فداہ امی وابی مکہ اور طائف کی وادیوں میں آفتاب جہاں تاب کی طرح گردش کرتے رہے اور پتھروں کے جواب میں ہدایت و سعادت کے پھول پھینکتے رہے۔ مکہ میں پہلے ان عقائد و حقائق کو ذہنوں میں راسخ کیا جاتا رہا جو پورے دین اسلام کی اساس اور بنیاد ہیں۔ توحید، رسالت اور آخرت یہی وہ محور ہے جس کے چاروں طرف دین اسلام گردش کرتا ہے۔ زندگی کا کوئی بھی مسئلہ ہو، اس کی بنیاد وہ عقائد ہی ہیں جن کی تعلیم اللہ و رسول نے دی ہے، خواہ مسائل زندگی کا تعلق معاشرے ہو یا معیشت سے، تہذیب و تمدن سے ہو یا سیاست سے۔ یہ بنیاد جس قدر مضبوط و محکم ہوگی، عمارت اسی قدر مضبوط و مستحکم ہوگی اور یہ بنیاد جتنی بودی اور کم زور ہوگی، عمارت بھی اتنی ہی بودی اور کم زور ہوگی۔ مکہ معظّمہ میں دو بڑے کام کیے گئے، ایک اساس دین کی تعمیر اور اس کا استحکام اور دوسرا زندگی کے تمام شعبوں کے لیے رہ نما اصول۔ مکہ معظّمہ میں تیرہ سال تک جو کچھ نازل ہوتا رہا، مدینہ منورہ میں اسی کے مطابق ریاست کی تشکیل اور معاشرے کی انفرادی و اجتماعی تعمیر کی گئی۔ جہاں تک اصول و کلیات کا تعلق ہے، شاید ہی ایسی کوئی اصل یا کلیہ نکل سکے جو مکہ میں نازل نہ ہوا ہو۔ اسلامی معاشرے کی تشکیل و تعمیر کے تمام بنیادی اصول مکہ ہی میں نازل ہو گئے تھے، بلکہ ان کی اچھی

خاصی تفصیل بھی نازل ہو چکی تھی۔ یہاں ان تمام آیتوں کو جمع کر کے ان کی تشریح کرنا ایک لمبا کام ہے اور اس کے لیے ایک ضخیم کتاب کی گنجائش چاہیے۔ میں یہاں صرف سورۂ النحل کی ایک آیت کی روشنی میں مثبت و منفی چند بنیادی اصول پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

سورۂ النحل کی آیت ۹۰ ہر جمعہ کو خطبے میں پڑھی جاتی ہے اور ہم اسے سنتے ہیں:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝

(النحل:۹۰)

”اللہ عدل، احسان اور قرابت داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی، بدی اور ظلم و سرکشی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تا کہ تم دھیان دو۔“

اس آیت سے پہلے کی یہ آیت ہے۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝ (النحل:۸۹)

”ہم نے تم پر یہ کتاب اتاری جو ہر چیز کا کھلا بیان ہے اور ہدایت و رحمت و بشارت ہے فرماں برداروں کے لیے۔“

اس آیت کے بعد آیت ۹۰ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (ہر چیز کا کھلا بیان) کو ثابت اور مدلل کرنے والی آیت ہے۔

## سورۂ النحل آیت ۹۰ کی جامعیت

خیر و شر، اخلاق حسنہ و سیئہ اور اسلامی معاشرے کی تعمیر و تشکیل کے مثبت و منفی بنیادی اصولوں کے لحاظ سے یہ قرآن کی جامع ترین آیت ہے۔[۱]

امام بخاری نے الادب المفرد میں، بیہقی نے شعب الایمان میں اور حاکم نے مستدرک

(۱) سورۂ النحل کی آیت ۹۰ پر میں نے اپنی کتاب 'انسان کا اخلاقی وجود' میں سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ یہ کتاب ماہ نامہ زندگی رامپور کی دس قسطوں میں پھیلی ہوئی ہے۔

میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کی ہے کہ یہ آیت خیر وشر کے لیے جامع ترین آیت ہے۔ بیہقی نے حسن بصریؒ سے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔ (روح المعانی)

یوں تو اس آیت نے عقائد تک کو اپنے دائرے میں لے لیا ہے، لیکن اس کا براہ راست تعلق محاسنِ اخلاق و مساوی اخلاق سے ہے۔ اچھے اخلاق کو عدل، احسان اور صلہ رحمی میں اور برے اخلاق کو فحشاء، منکر اور بغی میں جمع کیا گیا ہے۔ یہی چھ چیزیں اسلامی معاشرے کی مثبت و منفی بنیاد ہیں۔

ماوردی اور ابونعیم نے معرفۃ الصحابۃ میں عبدالملک بن عمیر سے روایت کی ہے۔ انھوں نے کہا: اکثم بن صیفی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی اطلاع ملی تو انھوں نے آپ کے پاس جانا چاہا، لیکن پہلے اس کی قوم کے دو افراد جانے کو تیار ہوئے۔ وہ دونوں آپ کے پاس پہنچے اور کہا ہم اکثم کے قاصد ہیں۔ وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کون ہو اور کیا لائے ہیں؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں محمد بن عبداللہ ہوں۔ خدا کا بندہ اور اس کا رسول، پھر آپ نے ان اللہ یامر بالعدل والی آیت تلاوت فرمائی۔ ان لوگوں نے پھر اپنا سوال دہرایا اور آپ نے پھر یہی آیت تلاوت فرمائی۔ یہاں تک کہ انھوں نے سن کر یاد کر لی اور پھر واپس جا کر اکثم کو تمام باتیں بتائیں۔ اس نے آیت سن کر کہا: میں دیکھتا ہوں کہ وہ مکارم اخلاق کا حکم دیتے ہیں اور برے اخلاق سے منع کرتے ہیں۔ پھر اکثم نے اپنی قوم سے کہا: اس معاملے میں تمھیں دوسروں سے پیچھے نہ رہنا چاہیے۔ نیز احمد، طبرانی اور بخاری نے الادب المفرد میں ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ یہی آیت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے دل میں استقرار ایمان کا سبب بنی تھی۔ اس آیت کی جامعیت ہی کی وجہ سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کو خطبۂ جمعہ میں داخل فرمایا اور یہ بات ان کے مآثر حسنہ میں داخل ہوگئی۔ ایک سے زیادہ علماء کا قول ہے کہ قرآن میں اس آیت کریمہ کے سوا اور کوئی آیت نہ ہوتی تو قرآن کے تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ہونے کے لیے کافی ہوتی۔ (روح المعانی)

اس آیت کے بارے میں ابن جریر نے قتادہ کا یہ قول نقل کیا ہے:

”اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہر ایسے خلق حسن کا حکم دیا ہے جس کو اہل جاہلیت بہ نظر استحسان

دیکھتے تھے اور ان کے یہاں اس پر عمل ہوتا تھا اور کوئی برا اخلاق ایسا نہیں ہے جس کو وہ عیب سمجھتے ہوں اور اس سے اللہ نے منع نہ کیا ہو۔"

اسلام کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل نے یہ آیت سنی تو کہا تھا اِنَّ اِلٰھہ لیامر بمکارم الاخلاق (محمد کا خدا مکارم اخلاق کا حکم دیتا ہے)۔

قاضی نے اپنی تفسیر میں ابن ماجہ سے حضرت علیؓ کی یہ روایت نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: جب اللہ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ وہ اپنے آپ کو قبائل عرب کے سامنے پیش کریں تو آپ اس مقصد سے نکلے۔ میں اور ابوبکرؓ بھی آپ کے ساتھ تھے۔ ہم قوم عرب کی ایک مجلس میں پہنچے۔ اہل مجلس پر سکون و وقار چھایا ہوا تھا۔ ابوبکر نے پوچھا: آپ لوگوں کا تعلق کس قبیلے سے ہے۔ انھوں نے جواب دیا: شیبان بن ثعلبہ سے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا: وہ قریش کے مقابلے میں آپ کی مدد کریں، کیوں کہ قریش نے آپ کی تکذیب کی ہے۔ مقرون بن عمرو نے کہا: آپ ہمیں کس امر کی طرف بلاتے ہیں؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اللہ یامر بالعدل والاحسان کی آیت تلاوت فرمائی۔ یہ سن کر مقرون بن عمرو نے کہا: خدا کی قسم آپ کی دعوت مکارم اخلاق اور محاسن اعمال کی دعوت ہے۔ وہ قوم خود جھوٹی ہے جو آپ کی تکذیب کرتی ہے۔ (تفسیر کبیر)

امام احمد نے مسند میں عثمان بن ابی العاصؓ سے روایت کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا تھا کہ آپ نے اپنی آنکھیں اٹھائیں اور فرمایا کہ جبریل نے آکر مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس آیت کو اس سورہ کے اس مقام پر رکھوں۔ (مختصر تفسیر ابن کثیر، ج ۲)

## اسلامی معاشرہ کی تعمیر کے بنیادی اصول

میں نے اس آیت کریمہ کے بارے میں یہ تفصیل تین وجوہ سے پیش کی ہے: ایک یہ کہ اس میں پیش کیے ہوئے بنیادی اصول کی جامعیت کا ایک اندازہ ہو، دوسری یہ کہ مکہ معظّمہ میں دعوت اسلامی کی جدو جہد کا ایک ذرا سا جلوہ نظر آجائے اور تیسری یہ کہ اس میں جو اصول بیان کیے گئے ہیں وہ عالم گیر ہیں اور کوئی معاشرہ ان اصولوں کے بغیر انسانی معاشرہ بھی نہیں بن سکتا، چہ جائیکہ وہ اسلامی معاشرہ بن سکے۔

## پہلا بنیادی اصول۔عدل

عدل صرف اسلامی معاشرے ہی کا بنیادی اصول نہیں، بلکہ اسی اصول پر پوری کائنات قائم ہے: و بالعدل قامت السموات والارض (عدل ہی پر آسمانوں اور زمین کا نظم قائم ہے)۔عدل، عدالۃ اور معدلۃ اتنے کثیر الاطراف وکثیر المعانی الفاظ ہیں کہ ان کی مدلل تشریح کے لیے متعدد صفحات درکار ہیں۔اس مختصر مقالے میں تشریح پیش نہیں کی جا سکتی۔اس لفظ کے لغوی معانی اور استعمالات کو سامنے رکھ کر میرے نزدیک اس کی جو جامع تعریف اخذ ہوتی ہے وہ یہ ہے:

''ہر شے کو وہ مقام دینا اور اس کے ساتھ افراط وتفریط سے بچتے ہوئے وہ معاملہ کرنا جس کی وہ مستحق ہو''

میرا خیال ہے کہ اس تعریف میں عدل کی تمام اقسام داخل ہوگئی ہیں۔انسان کے اپنے نفس سے لے کر کائنات کی تمام حقیقتیں اور تمام اشیاء اس تعریف کے دائرے میں ہیں۔

## عدل کے ہم معنی الفاظ

عدل کا ایک ہم معنی دوسرا لفظ، جو قرآن بہ کثرت اور شاید یہ کہنا صحیح ہو کہ تعداد میں خود لفظ عدل سے زیادہ استعمال ہوا ہے، وہ قسط ہے، لسان العرب میں ہے: والقسط بالکسر العدل و ھو من المصادر الموصوف بھا کعدل (قسط کے معنی عدل ہیں اور یہ ان مصادر میں ہے جو مصدر عدل کی طرح وصف بن کر بھی استعمال ہوئے ہیں۔) عدل اور قسط میں لغوی استعمال کے لحاظ سے فرق یہ ہے کہ باب مجرد سے قسط کا اسم فاعل صرف ظالم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔عادل کے معنی میں مقسط استعمال ہوتا ہے۔سورۂ جن میں ہے:

وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ۝ (آیت:۱۵)

''اور جو بے انصاف ہیں، وہ ہوئے دوزخ کے ایندھن۔''

سورۂ المائدۃ میں ہے:

وَ اِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○ (المائدۃ:۴۲)

''اور فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

قسط کے علاوہ تین الفاظ اور ہیں جنھیں قرآن نے عدل کے معنی میں استعمال کیا ہے: قسطاس، میزان، حق۔ قسطاس اور میزان تو محض لفظ کے اعتبار سے دو ہیں۔ ورنہ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ قسطاس بھی میزان ہی کو کہتے ہیں۔ مفردات امام راغب میں ہے: والقسطاس، المیزان، یعبر به عن العدالة كما یعبر عنها بالمیزان۔ ''قسطاس کے معنی میزان کے ہیں اور یہ دونوں الفاظ عدالت کی تعبیر کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔'' امام راغب نے مادہ وزن کے تحت لکھا ہے:

و قوله وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ و اَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ اشارة الی مراعاة العدالة فی جمیع ما یتحراه الانسان من الافعال والاقوال۔

''اللہ کا قول وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ اور اَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ اشارہ ہے عدل کی رعایت کا ان تمام افعال واقوال میں جن کا انسان قصد کرتا ہے۔''

حق کا لفظ بھی قرآن میں عدل و انصاف کے معنی میں آیا ہے۔ سورۂ ص میں ہے: فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ (آیت ۲۲) فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (آیت ۲۶)۔ ان دونوں فقروں میں حق کا لفظ عدل و انصاف کے معنی میں آیا ہے۔

## عدل بطور اخلاق

اللہ تعالیٰ نے اسلامی معاشرے کو عدل و قسط پر تعمیر کرنے کا جو حکم دیا ہے اس کی حیثیت محض اتنی نہیں ہے کہ کبھی کبھی عدل اختیار کر لیا جائے اور نہ یہ ہے کہ عدل کی کوئی خاص قسم پسند کر لی جائے، بلکہ یہ ہے کہ معاشرے کا ہر فرد اور ہر خاندان اس کو اپنی صفت اور اپنا اخلاق بنا لے اور

عدل کے کلی اور جامع مفہوم کو ہمیشہ پیش نظر رکھے۔ وہ ہے کانٹے کی تول۔ اللہ کے حقوق، بندوں کے حقوق، اپنے نفس کے حقوق اور کائنات کی دیگر اشیاء کے حقوق ادا کرنے اور اس کا کوئی قول وفعل اس ترازو میں تلے بغیر باہر نہ آئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خلق یعنی اخلاق کا اطلاق ہوتا ہی اس صفت پر ہے جو ملکہ یعنی نفس کی کیفیت راسخہ بن جائے۔ کسی اخلاق سے جب کوئی انسان متصف ہوجاتا ہے تو وہ اس سے دائماً اور بہ سہولت صادر ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً سخاوت جب کسی انسان کا اخلاق بن جاتی ہے تو اسے بخل سے بیزاری ہوجاتی ہے۔ اس کے لیے سخاوت آسان اور بخل دشوار ہوجاتا ہے۔ عدل کی جامع تعریف سامنے رکھنے کے بعد اس میں کوئی شبہہ باقی نہیں رہتا کہ اس خلق حسن سے محرومی ہر خیر سے محرومی اور اس کی یافت ہر خیر کی یافت ہے۔

افراد کے بگاڑ سے خاندانوں میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور خاندانوں کے بگاڑ سے معاشرہ بگڑتا ہے۔ کیوں کہ معاشرہ نام ہی ہے خاندانوں کے مجموعے کا۔ افراد میں بگاڑ اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ وہ نہ اللہ کے حقوق عدل وانصاف سے ادا کرتے ہیں اور نہ دوسرے افراد خاندان کے حقوق۔ وہ صفت عدل سے عاری ہوجاتے ہیں۔ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے حاشیۂ قرآن میں لکھا ہے:

> ''عدل'' کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے تمام عقائد، اعمال، اخلاق، معاملات، جذبات، اعتدال وانصاف کی ترازو میں تلے ہوں، افراط وتفریط سے کوئی پلّہ جھکنے یا اٹھنے نہ پائے۔ سخت سے سخت دشمن کے ساتھ بھی معاملہ کرے تو انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اس کا ظاہر وباطن یکساں ہو۔ جو بات اپنے لیے پسند نہ کرتا ہو، اپنے بھائی کے لیے بھی پسند نہ کرے۔''

'عدل' کی اس تشریح کو سامنے رکھ کر تصور کیجیے اس معاشرے کا جس کے افراد اس صفت سے متصف ہوں، وہ کتنا صاف ستھرا اور امن وسکون کا معاشرہ ہوگا۔ امن وسکون میں خلل تو اس لیے واقع ہوتا ہے کہ لوگ دوسروں کے حقوق کم سے کم بھی ادا نہیں کرتے اور اپنے حقوق زیادہ سے زیادہ وصول کرنے پر اصرار کرتے اور اس کے لیے آمادۂ پیکار رہتے ہیں۔

اوپر کی تشریح میں عقائد کا ذکر اس لیے آیا ہے کہ کائنات میں سب سے بڑا عدل 'توحید' اور سب سے بڑا 'ظلم' شرک ہے۔

## دوسرا بنیادی اصول۔احسان

صفت احسان کی حقیقت سمجھنے کے لیے صفت عدل کی تشریح سامنے رہنی چاہیے، اس لیے کہ 'احسان' عدل پر ایک اضافہ ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے حاشیۂ قرآن میں لکھا ہے:

''احسان کے معنی یہ ہیں کہ انسان بذاتِ خود نیکی اور بھلائی کا پیکر بن کر دوسروں کا بھلا چاہے۔ مقام عدل و انصاف سے ذرا اور بلند ہو کر فضل و عفو اور تلطّف و ترحّم کی خوٗ اختیار کرے۔ فرض ادا کرنے کے بعد تطوّع و تبرّع کی طرف قدم بڑھائے۔ انصاف کے ساتھ مروّت کو جمع کرے اور یقین رکھے کہ جو کچھ بھلائی کرے گا، خدا اسے دیکھ رہا ہے۔ اُدھر سے بھلائی کا جواب ضرور بھلائی کی صورت میں ملے گا۔''

مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

''احسان عدل سے ایک زائد شے ہے۔ یہ صرف حق کی ادائیگی ہی کا تقاضا نہیں کرتا، بلکہ مزید برآں یہ تقاضا بھی کرتا ہے کہ دوسرے کے ساتھ ہمارا معاملہ کریمانہ اور فیاضانہ ہو۔'' (تدبر قرآن جلد ۲ ص ۶۸۵)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ نے احسان کی یہ تشریح کی ہے:

دوسری چیز 'احسان' ہے، جس سے مراد ہے نیک برتاؤ، فیاضانہ معاملہ، ہمدردانہ رویہ، خوش خلقی، درگزر، باہمی مراعات، ایک دوسرے کا پاس و لحاظ، دوسرے کو اس کے حق سے کچھ زیادہ دینا اور خود اپنے حق سے کچھ کم پر راضی ہو جانا۔ یہ انصاف سے زائد ایک چیز ہے، جس کی اہمیت اجتماعی زندگی میں عدل سے بھی زیادہ ہے۔ عدل اگر معاشرے کو ناگواریوں اور تلخیوں سے بچاتا ہے تو احسان اس میں خوش گواریاں اور شیرینیاں پیدا کرتا ہے۔ کوئی معاشرہ صرف اس بنیاد پر کھڑا نہیں رہ سکتا کہ اس کا ہر فرد ہر وقت ناپ تول کر کے دیکھتا رہے کہ اس کا کیا حق ہے اور اسے وصول کر کے چھوڑے اور دوسرے کا کتنا حق ہے اور اسے بس اتنا ہی دے دے۔ ایسے ٹھنڈے اور کھرے معاشرے میں کش مکش تو نہ ہوگی، مگر محبت اور شکر گزاری اور عالی ظرفی اور

اخلاص وخیر خواہی کی قدروں سے وہ محروم رہے گا، جو دراصل زندگی میں لطف وحلاوت پیدا کرنے والی اور اجتماعی محاسن کو نشوونما دینے والی قدریں ہیں۔ (تفہیم القرآن، ج ۲)

غور کرنے کی بات ہے کہ عہد رسالت میں کن بنیادوں پر اسلامی معاشرے کی تعمیر و تشکیل کی گئی تھی اور آج ہمارا حال کیا ہے؟ 'احسان' پر عمل کرنے والا تو شاید ہزاروں میں ایک ہو۔ یہاں تو عدل بھی غائب ہے اور ظلم وزیادتی کا راج ہے۔ مسلمان افراد اور خاندان پر ظلم کر رہا ہے اور اس سے بے خبر ہے کہ دوسروں پر ظلم خود اپنے اوپر ظلم ہے۔ ہوسکتا ہے کہ دنیا میں اپنے اوپر ظلم کا اثر دکھائی نہ دے، لیکن آخرت میں یہ ضرور دکھائی دے گا کہ دوسروں پر ظلم کر کے اس نے خود اپنے اوپر کتنا بڑا ظلم کیا تھا۔

## تیسرا بنیادی اصول۔صلہ رحمی

'ایتاء ذی القربیٰ' (قرابت داروں کو دیتے رہنا) صلہ رحمی کی تعبیر ہے۔ عدل واحسان میں 'صلہ رحمی' داخل ہے، لیکن اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کا مستقل علیٰحدہ سے حکم دیا گیا ہے۔ اسلامی معاشرے میں، جو خاندانوں کے مجموعے کا نام ہے، صلہ رحمی کی جو اہمیت ہے اس پر لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ہر انسان خواہ وہ پڑھا لکھا ہو یا ناخواندہ، اس کی اہمیت سے عملاً واقف ہے۔

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے حاشیۂ قرآن میں لکھا ہے:

> ''صلۂ رحم ایک مستقل نیکی ہے جو اقارب و ذوی الارحام کے لیے درجہ بہ درجہ استعمال ہونی چاہیے۔ گویا 'احسان' کے بعد ذوی القربیٰ کا بالتخصیص ذکر کر کے متنبہ فرمادیا کہ عدل وانصاف تو سب کے لیے یکساں ہے، لیکن مروت واحسان کے وقت بعض مواقع بعض سے زیادہ رعایت واہتمام کے قابل ہیں۔ فرق مراتب کو فراموش کرنا ایک طرح سے قدرت کے قائم کیے ہوئے قوانین کو بھلانا ہے۔''

صلہ رحمی کے حکم اور اس کی ترغیب وتلقین سے قرآن بھی بھرا ہوا ہے اور احادیث بھی۔ احسان اور صلہ رحمی کے سب سے اول اور سب سے زیادہ مستحق والدین ہیں اور ان دونوں میں بھی ماں، باپ سے زیادہ احسان اور صلہ رحمی کی مستحق ہے۔ اس سلسلے کی آیتیں اور احادیث جمع

کی جائیں تو ایک مستقل طویل مقالہ الگ سے مرتب کرنا ہوگا۔ صلہ رحمی کی تشریح کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے لکھا ہے۔

''صلہ رحمی، جو رشتہ داروں کے معاملے میں احسان کی ایک خاص صورت متعین کرتی ہے، اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اور خوشی اور غمی میں ان کا شریک حال ہو اور جائز حدود کے اندر ان کا حامی و مددگار بنے، بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ ہر صاحب استطاعت شخص اپنے مال پر صرف اپنی ذات اور اپنے بال بچوں ہی کے حقوق نہ سمجھے، بلکہ اپنے رشتہ داروں کے حقوق بھی تسلیم کرے۔ شریعت الٰہی ہر خاندان کے خوش حال افراد کو اس امر کا ذمہ دار قرار دیتی ہے کہ وہ اپنے خاندان کے لوگوں کو بھوکا ننگا نہ چھوڑیں۔ اس کی نگاہ میں ایک معاشرے کی اس سے بدتر کوئی حالت نہیں ہے کہ اس کے اندر ایک شخص عیش کر رہا ہو اور اسی کے خاندان میں اس کے اپنے بھائی بند روٹی کپڑے تک کو محتاج ہوں۔ وہ خاندان کو معاشرے کا ایک اہم عنصر ترکیبی قرار دیتی ہے اور یہ اصول پیش کرتی ہے کہ ہر خاندان کے غریب افراد کا پہلا حق اپنے خاندان کے خوش حال افراد پر ہے۔ پھر دوسروں پر ان کے حقوق عائد ہوتے ہیں اور ہر خاندان کے خوش حال افراد پر پہلا حق ان کے اپنے غریب رشتہ داروں کا ہے۔

پھر دوسروں کے حقوق ان پر عائد ہوتے ہیں، یہی بات ہے جس کو نبی ﷺ نے اپنے مختلف ارشادات میں وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ چناں چہ متعدد احادیث میں اس کی تصریح ہے کہ آدمی کے اولین حق دار اس کے والدین، اس کے بیوی بچے اور اس کے بھائی بہن ہیں۔ پھر وہ جو ان کے بعد قریب تر ہوں اور پھر وہ جو ان کے بعد قریب تر ہوں۔ اور یہی اصول ہے جس کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک یتیم بچے کے چچازاد بھائیوں کو مجبور کیا کہ وہ اس کی پرورش کے ذمہ دار ہوں اور ایک دوسرے یتیم کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اگر اس کا کوئی بعید ترین رشتہ دار بھی موجود ہوتا تو میں اس پر اس کی پرورش لازم کر دیتا۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جس معاشرے کا ہر واحدہ (یونٹ) اس طرح اپنے اپنے افراد کو سنبھال لے اس میں معاشی حیثیت سے کتنی خوش حالی، معاشرتی حیثیت سے کتنی حلاوت اور اخلاقی حیثیت سے کتنی پاکیزگی و بلندی پیدا ہو جائے گی۔'' (تفہیم القرآن، ج ۲)

## وہ چیزیں جن سے اسلامی معاشرہ کو پاک ہونا چاہیے

اسلامی معاشرہ کی تعمیر و تشکیل کے یہ تین مثبت بنیادی اصول ہیں اور اسی کے مقابلے میں تین منفی چیزیں ہیں، جن سے اسلامی معاشرے کو پاک صاف ہونا چاہیے۔

### اول: فحشاء

فحشاء کھلی ہوئی بے حیائی کے کام کو کہتے ہیں، جن میں سب سے نمایاں زنا اور عملِ قومِ لوط ہے، پھر برہنگی و عریانی، گالی گلوچ، بدکلامی، بدکاریوں پر ابھارنے والے افسانے اور ڈرامے اور فلم، عریاں تصاویر، عورتوں کا بن سنور کر منظر عام پر آنا، علی الاعلان مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط ہونا اور اسٹیج پر عورتوں کا ناچنا اور تھرکنا اور ناز و ادا کی نمائش کرنا، یہ سب چیزیں فحشاء میں داخل ہیں اور ان میں اکثر زنا کے وسائل ہیں۔ عہدِ حاضر میں ایک نہایت شنیع بدکاری یعنی لواطت نے یورپ اور امریکہ میں وہ مقام حاصل کر لیا ہے، جو اس فعل بد کو قوم لوط میں حاصل تھا۔

### دوم: منکر

اس سے مراد ہر وہ برائی ہے جس کو انسان بالعموم برا جانتے ہیں، انسانی فطرت ان سے اِبا (انکار) کرتی ہے اور تمام آسمانی شریعتوں نے جن کو برائی قرار دیا ہے۔ جیسے جھوٹ، اتہام، چوری، رہ زنی وغیرہ۔

### سوم: بغی

اس کے معنی زیادتی، سرکشی اور دوسروں کے حقوق پر دست درازی کے ہیں، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا۔

ان چھ چیزوں کی لغوی تشریحات اور اس سلسلے کی آیات و احادیث کو جمع کرنا بہت لمبا کام ہے۔ جتنی باتیں لکھی گئی ہیں ان سے بھی یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ جس معاشرے میں عدل و احسان اور صلہ رحمی کی نسیم جاں نواز چل رہی ہو اور وہ فحشاء و منکر اور زیادتی و تعدی کے

بادِ سموم سے محفوظ ہو وہی اسلامی معاشرہ ہے اور یہی معاشرہ ہے جسے وجود میں لانے کے لیے ہم سب کو وہ سب کچھ کرنا چاہیے جو ہم کر سکتے ہیں۔

سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۲۲ تا ۳۹ کو بعض مفسرین قرآن نے بجا طور پر سورۂ نحل کی آیت ۹۰ کی تفصیل و تشریح قرار دیا ہے۔ ہم یہاں صرف ان کی فہرست پیش کرنے پر اکتفا کریں گے:

''تو اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بنا ورنہ ملامت زدہ اور بے یار و مددگار بیٹھا رہ جائے گا تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ

(۱)　تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اس کی۔

(۲)　والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمھارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انھیں اف تک نہ کہو، نہ انھیں جھڑک کر جواب دو اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو کہ پروردگار! ان پر رحم فرما جس طرح انھوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔ تمھارا رب خوب جانتا ہے کہ تمھارے دلوں میں کیا ہے۔ اگر تم صالح بن کر رہو تو وہ ایسے سب لوگوں کے لیے درگزر کرنے والا ہے جو اپنے قصور پر متنبہ ہو کر بندگی کے رویے کی طرف پلٹ آئیں۔

(۳)　رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق۔

(۴)　فضول خرچی نہ کرو۔ فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

(۵)　اگر ان سے (یعنی حاجت مند رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں سے) تمھیں کترانا ہو، اس بنا پر کہ ابھی تم اللہ کی اس رحمت کو، جس کے تم امیدوار ہو، تلاش کر رہے ہو تو انھیں نرم جواب دے دو۔

(۶)　نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھو اور نہ اسے بالکل ہی کھلا چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ۔ تیرا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور انھیں دیکھ رہا ہے۔

(۷) اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم انھیں بھی رزق دیں گے اور تمھیں بھی۔ در حقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے۔

(۸) زنا کے قریب نہ پھٹکو۔ وہ بہت برا فعل ہے اور بڑا ہی برا راستہ۔

(۹) قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ۔ اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو اس کے ولی کو ہم نے قصاص کے مطالبے کا حق عطا کیا ہے۔ پس چاہیے کہ وہ قتل میں حد سے نہ گزرے، اس کی مدد کی جائے گی۔

(۱۰) مال یتیم کے پاس نہ پھٹکو مگر احسن طریقے سے، یہاں تک کہ وہ اپنے شباب تک پہنچ جائے۔

(۱۱) عہد کی پابندی کرو۔ بے شک عہد کے بارے میں تم کو جواب دہی کرنی ہوگی۔

(۱۲) پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو اور تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو، یہ اچھا طریقہ ہے۔

(۱۳) کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمھیں علم نہ ہو۔ یقیناً آنکھ، کان اور دل سب ہی کی باز پرس ہونی ہے۔

(۱۴) زمین میں اکڑ کر نہ چلو۔ تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو، نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔ ان احکام میں ہر ایک کا برا پہلو تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ یہ وہ حکمت کی باتیں ہیں جو تیرے رب نے تجھ پر وحی کی ہیں اور دیکھ اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بنا بیٹھ، ورنہ تو جہنم میں ڈال دیا جائے گا ملامت زدہ اور ہر بھلائی سے محروم ہو کر۔"

یہ ہے اسلامی معاشرہ کا وہ نقشہ جس کے مطابق اس کی عمارت بنتی ہے۔ یہ خاکہ مکہ معظّمہ میں نازل ہو گیا تھا، مدینہ منورہ میں اسی خاکے میں رنگ بھرا گیا اور اس معاشرے کی تشکیل ہوئی جس کی نظیر سے انسانی تاریخ خالی ہے اور جس کی تمنا ہر مخلص مسلمان کے دل میں آج بھی ہے۔ کاش ہم ایسے معاشرے کی تعمیر کے لیے جدوجہد بھی کرتے۔

(ماہ نامہ زندگی نو نئی دہلی، مئی ۱۹۸۶ء)